ہندستانی لسانیات

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ہندستانی لسانیات

جس کے

پہلے حصے میں لسان کے مقاصد، فوائد اور تاریخ اور زبان کی ماہیت، ارتقا اور تشکیل سے متعلق عام اور اصولی معلومات قلمبند کر کے دنیا کی زبانوں کی تقسیم مختلف خاندان اور خاصکر ہندستان کی زبانوں پر بحث کی گئی ہے

اور

دوسرے حصے میں اردو کے آغاز، ارتقا، ادبی بولیوں اور ہمہ گیری پر جدید ترین تحقیقات پیش کر کے اردو ہندی کے جھگڑے اور اردو کے جدید رجحانوں اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
ایم، اے، پی ایچ ڈی لندن
پروفیسر اردو جامعۂ عثمانیہ، پرنسپل دارالعلوم کالج
و معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن

قیمت

تین روپیہ

ناشر

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

ٹیلیفون ۴۵۵۹

ناشر: عزیز الرحمٰن　　مارچ سنہ ۱۹۶۰ء　　پرنٹر: شاہی پریس لکھنؤ

(تعداد اشاعت ۱۱۰۰)

فہرست

دیباچہ

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی
سابق صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

حصّۂ دوم

دیباچہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ لسان، زبان کو کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ "لسانیات" اس علم کو کہتے ہیں جس کا موضوع زبان کے مسائل ہیں۔ زبان اور اس کے مسائل کوئی نئی چیز نہیں۔ جب سے انسان دنیا میں آیا ہو اسی زمانے سے زبان کا سکہ چلا۔ اور کیوں نہ ہو؟ جس چیز نے آدمی کو نِری حیوانیت کی پستی سے اُٹھا کر انسانیت کی بلندی پر لا کھڑا کیا اس کے اظہار کا ذریعہ سوا زبان کے اور کیا ہے؟ منطق کو سارے علموں کا سرچشمہ مانتے ہیں، لیکن اگر زبان کی مدد شامل حال نہ ہو تو نطق اُدھورا ہے اور ساری منطق ہیچ۔ جس طرح منطق ایک علم بھی ہے اور ایک فن بھی، اُسی طرح زبان کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔ کسی زبان کو بولنا اور فصاحت کے ساتھ بولنا ایک فن ہے، زبان کے اصول جاننا اور ان میں ایک نظام قائم کرنا علم ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر بولنے والا زبان کے اُصول سے واقف نہیں ہوتا، معمار نہندس، دونوں کو عمارت سے واسطہ ہے، مگر دونوں کی حیثیتیں جُدا جُدا۔

زبانیں بہت ساری ہیں اور اگلے زمانے میں بھی (جبکہ تقابلی لسانیات کی بنیاد نہیں پڑی تھی) کبھی کبھی ایک ہی شخص کئی زبانیں سیکھ لیا کرتا تھا، مگر لسانی تحقیق (یا "زباں دانی") کی بِنا ایک ہی زبان پر ہوتی تھی۔ ایک ہی زبان کے مطالعے سے جو نتائج نکلتے انھیں کی مدد سے انسانی زبان کے بعض مشترک اُصول اور قوانین بھی

دیباچہ

قیاس کر لئے جاتے تھے ادھر کوئی ڈیڑھ سو برس سے یورپ میں یہ کوشش جاری ہو کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کسی ایک زبان کو دوسری سے کہاں تک تعلق ہے۔ اور ہے تو کس قسم کا، ان تعلقات کو معلوم کرنے کے بعد تمام دنیا کی زبانوں کو کتنے مختلف گروہوں یا "خاندانوں" میں تقسیم کر سکتے ہیں، اس طریقے کے ذیل میں نئی اور پرانی سب ہی زبانیں زیر تحقیق آئیں اور آرہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ہمہ گیر معلومات کی بنا پر جو اصول قائم کئے گئے ہیں وہ زیادہ بھروسے کے قابل ہیں۔ انھیں اصول کو "لسانیات" کا نام دیا گیا ہے۔

لسانیاتی تحقیق کے دو ذریعے ہیں، ایک فلسفی، دوسرا تاریخی۔ دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی کم زور ہے تو تحقیق ناقص ہوگی۔ منطق اور فلسفے کا کام یہ ہے کہ جو مواد حاصل ہو اس کی تقسیم اور ترتیب کر کے لسانی قوانین دریافت اور اصول قائم کرے، لیکن ضروری مواد کا مہیا کرنا تاریخی ذریعے کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اگر صرف موجودہ زبانوں کی محض موجودہ حالت کو دیکھکر اُصول قائم کر لئے جاتے ہیں تو انھیں زبانوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر بھی اکثر اُن سارے اُصول کو تہ وبالا کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ تاریخ سے یہاں وہ تاریخ مراد نہیں جس میں حکمرانوں کے ناموں اور کچھ واقعات کی ایک فہرست ہوتی ہو اور سنوں کے اعداد کا ایک انبار، بلکہ وہ تاریخ مراد ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ انسان کے جسم، اس کے دل، اس کے دماغ، اس کی روح پر اس دنیا کے لاتعداد دَوروں اور قرنوں میں کیا کیا گزری اور کتنی منزلوں کو طے کر کے یہ نوبت آئی جس کا مشاہدہ ہم آج کر رہے ہیں۔ یہ تو زمانے کی بحث ہوئی۔ ایک اور چیز بھی ہے جس پر نظر رکھنا لسانیات

دیباچہ

کے محقق کو لازم ہے۔ وہ مکان (یعنی مقام یا جگہ) ہے۔ ملک کی زمین کی نوعیت اور خصوصیات، اس کی آب و ہوا کی کیفیت اور اثر، اس کے موسموں کا تفاوت، یہ سب چیزیں ملک کے بسنے والوں کے خصائل، اُن کی ضروریات، ان کے رسم و رواج کو متاثر کرتی ہیں اور زبان کی تشکیل میں اِن سب کا حصّہ بہت نمایاں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہماری لسانی تحقیق کو زمان اور مکان دونوں کے لحاظ سے صحیح ہونا چاہیے اور انسانی علوم کے مسلّمات سے خلاف نہ ہونا چاہیے۔

غرض کہ لسانیات، انسانی علم کی ہر شاخ سے غذا حاصل کرتی ہے اور اس کے معاوضے میں ہر علم کو قوت پہنچاتی ہے۔ لسانیات ہی کے میدان میں پہنچ کر یہ حقیقت ہم پر پوری وضاحت اور درخشانی کے ساتھ منکشف ہوتی ہے کہ سب انسانی علوم آپس میں متداخل ہیں اور اسی تداخل سے وہ بار ور ہوتے ہیں۔

یورپ کی اکثر زبانوں، خصوصاً جرمنی اور فرانسیسی میں لسانیات کا اتنا وافر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے کہ انگریزوں کی سی اولوالعزم قوم کے لئے بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ اگر وہ چاہے بھی تو اسے اپنی زبان میں منتقل کر سکے۔ ایک جرمانیا ہی میں کتابوں کے علاوہ سیکڑوں رسالے شائع ہوتے ہیں جن کا موضوع صرف لسانیات ہے۔ اس ذخیرے میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ہندوستان بجائے خود ایک برّاعظم ہے اور اس برّاعظم میں چھوٹی بڑی کوئی ستّو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس لئے لسانیاتی مواد کی ملک میں بہتات ہے جس کا ایکجا کرنا اور ترتیب دینا ایک نہایت اہم کام ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی کتابیں مہیا کی جائیں جن کے مطالعے سے لسانیات کے اصول

دیباچہ

اور اس کے مختلف مباحث ہمارے ہاں کے اہلِ علم کے روشناس ہوں۔ اُردو میں ابتک کوئی کتاب اس مضمون پر نہیں۔ مسرت کا مقام ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے اس جانب پہلا قدم اُٹھایا ہے اور "ہندوستانی لسانیات" کے نام سے یہ مختصر مگر جامع اور نہایت مفید کتاب لکھی ہے جس میں اہم لسانیاتی مسائل اور خاص طور پر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم اور ان کے باہمی تعلقات سے سلیس زبان اور دِل نشین پیرائے میں بحث کی ہے۔ اس وقت ایسی ہی مختصر اور جامع کتاب کی ضرورت بھی تھی، جو آنے والی مفصل اور ضخیم کتابوں کے مقدمے کا کام دے اور جس سے پڑھنے والوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد فائدہ اُٹھا سکے۔

یقین ہے کہ "ہندستانی لسانیات" کو نہ صرف اکثر یونیورسٹیاں بعض مدارج کے نصاب میں داخل کریں گی بلکہ یہ کتاب ملک میں عام مقبولیت بھی حاصل کرے گی اور اِس طرح حضرت مؤلف کے حوصلے بڑھائے گی بلکہ نوجوان طالب علموں اور مصنفوں کو ایک اہم اور نہایت مفید مضمون کی طرف متوجہ کردے گی۔

ع۔ صدیقی۔

الہ آباد۔

۴ ستمبر ۱۹۳۲ء

تمہید

ہماری زبان کے لسانی پہلوؤں پر آج تک بہت کم تحقیقات کی گئی ہیں اور جو کچھ کی گئیں وہ دوسری زبانوں میں قلمبند ہوئی ہیں۔ خود اُردو زبان میں (سوائے پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" کے) کوئی حکیماتی اور قابل توجہ کام نہیں کیا گیا یہ جیسی اہم ضرورت ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں اپنی زبان اور ادب کے کسی نہ کسی شعبہ میں کام کرنے یا اس پر غور و خوض کرنے کا موقع ملا ہو، جو اپنی زبان کو دنیا کی شائستہ زبانوں کی صف میں دیکھنے کے خواہشمند ہوں، یا جن کی نظریں ترقی یافتہ زبانوں کے کارناموں سے روشناس ہوں۔

اُردو میں خال خال ایسی تحریریں مل جاتی ہیں جن میں اس کی لسانی خصوصیتوں کے متعلق منتشر اور سطحی معلومات دستیاب ہوتی ہیں مگر جدید ترین طرز تحقیقات کی رو سے انھیں زیادہ وقیع نہیں سمجھا جاتا۔ جنگ عظیم کے بعد سے جب لسانیات سے کچھ شغف رکھنے والے یورپ سے تعلیم پاکر ہندستان آنے لگے تو اس کی طرف ارباب علم و فضل کی توجہ منعطف ہونی شروع ہوئی۔ لیکن اُردو زبان میں چونکہ علمی اور فنی اصطلاحوں کی کمی ہے اور یہ موضوع ان کا سخت محتاج ہے۔ اس لئے اس کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں کی گئی۔

(۲)

ارباب اُردو کی ایک سخت غلط فہمی نے بھی اس ضروری موضوع کو پس پشت ڈال دیا

تمہید

وہ یہ سمجھتے رہے، اور بعض شاید اب بھی سمجھتے ہوں گے کہ زبان کے متعلق تحقیقات کرنا اُسکے قواعد و ضوابط مقرر کرنا اور اس پر غور و خوض کرنا اہلِ زبان کا کام نہیں ہے۔

اس خیال سے بڑھ کر گمراہ کن اور تنزل کی طرف لے جانے والے مغالطہ میں اردو بولنے والی قوم شاید ہی کبھی پھنسی ہو۔ اس کی وجہ سے اس نے اپنا اور اپنی زبان کا وہ وقار غالباً ہمیشہ کے لئے کھو دیا جو اس کو آج سے ایک صدی قبل تمام ہندستان میں حاصل تھا۔ اسی نے اُردو کی ہمہ گیری کو سخت صدمہ پہنچایا، اسی کے باعث ہندستان کی دوسری جدید زبانیں آج جدا جدا ادبی اہمیتوں کی مالک بن گئی ہیں، اور اسی کی بنا پر اُردو ہندی جھگڑا شروع ہوا، اور بہت جلد ایک ایسی مستقل حیثیت حاصل کر لی کہ آج اس سے پیچھا چھڑانا دشوار نظر آتا ہے۔

ہمارے اکثر بڑے بڑے عالم اور انشا پرداز اپنی اپنی زبان کے آغاز، ارتقا اور ساخت سے یا تو قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں یا پھر ان کی نسبت غلط خیالات اور نظریے قائم کر لیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہی غیر ذمہ دارانہ باتیں نئی پود کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہتی ہیں اور اس طرح غلطیاں اور غلط فہمیاں ابتدا سے دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہیں۔

سب سے معمولی اور عام غلط فہمی یہ ہے کہ ہندی اور برج بھاشا کو ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ سمجھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو سے ہندی نکلی۔ حالانکہ یہ دونوں خیال غلط ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب کے دوسرے حصے کے مطالعہ سے معلوم ہوگا نہ تو اُردو برج بھاشا سے نکلی اور نہ برج بھاشا کا نام ہندی ہے۔ ہندی اُردو کی جدید ترین شاخ کا نام ہے جو فورٹ ولیم کالج کے قیام (انیسویں صدی کے آغاز) کے بعد سے ناگری رسم الخط میں لکھی جانے لگی ہے، اور جس پر فارسی اور عربی کی جگہ برج بھاشا اور

تمہید

سنسکرت کا اثر زیادہ ہے۔ برج بھاشا وہ زبان ہے جو مسلمانوں کی فتح دہلی کے وقت سے سرزمین برج میں شعروشاعری کے لئے مستعمل ہے اور جس کی تقلید روز بروز ہندی کو اردو سے مختلف اور جدا کرتی جارہی ہے۔

(۳)

اس قسم کی غلط فہمیوں کو دور کرنا اور السنہ و لسانیات سے متعلق صحیح قسم کی معلومات پھیلانا اس کتاب کی ترتیب کا باعث ہوا۔ اسی خیال کو ملحوظ رکھ کر راقم الحروف نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں حتی الامکان کوشش کی کہ جدید اصول لسانیات سے واقفیت پیدا ہو سکے اور آریائی لسانیات کا تقابلی مطالعہ اور خاص کر اردو کی ساخت پر تحقیقات کی جائیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے تحت "اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن" میں پروفیسر آر، ایل، ٹرنر کے آریائی لسانیات کے لکچروں سے استفادہ کیا انھوں نے اپنی عنایت سے اردو زبان کے ارتقا اور ساخت پر بحث و مباحثہ کرنے کے لئے اپنے ہفتہ واری نظام الاوقات میں بھی باضابطہ طور پر وقت نکالا۔ آخرکار ان کی اور مشہور ماہر اردو ڈاکٹر گریہم بیلی کی مدد اور مشوروں کے بعد اردو کے آغازی ادب کے متعلق جو مقالہ لکھا اس کا کچھ ابتدائی حصہ "ہندستانی صوتیات" میں شائع ہو چکا ہے اور اس کتاب میں ترمیم و اضافوں کے ساتھ شامل کیا جارہا ہے۔

اردو کے صوتی تجزیہ و تشریح میں اس متذکرہ درسگاہ کے "صدر شعبہ صوتیات" پروفیسر لارڈ جمیس نے بڑی اعانت کی، اور عام صوتیات پر اپنے لکچروں میں شریک رکھنے کے علاوہ اس علم کے اصول و ضوابط اور انگریزی صوتیات کی تعلیم کے لئے یونیورسٹی کالج لندن کے شعبہ صوتیات میں شریک ہونے میں مدد دی۔

تمہید

پیرس میں "سوربون یونیورسٹی" کے ادارۂ صوتیات" میں مدموزیل دیران نے تجرباتی صوتیات سے واقف ہونے اور آلوں اور گردونوں پر اُردو زبان کو قلمبند کرنے میں بڑی رہبری کی، اس کام کے چند نمونوں کے عکس "ہندستانی صوتیات" میں شامل کئے گئے اور اب اس عملی کام کے بعض نتائج اس میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں پروفیسر شرامک (پروفیسر صوتیات، کالج دے فرانس) کا بھی شکر گذار ہوں۔

پیرس ہی کے قیام کے دوران میں وہاں کے "قومی مدرسۂ السنۂ مشرقیہ" میں ڈاکٹر جیولس بلوک (رکن ادارۂ تحقیقات عالیہ، پیرس یونیورسٹی) کے جپسی زبان کے درسوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ انہی کے ساتھ اردو کی گجراتی شکل پر کام شروع کیا گیا جو اگرچہ ابھی نامکمل ہے لیکن آئندہ صفحات میں اس کے چند ضروری اور متعلقہ اجزا مندرج کر دئے گئے ہیں۔

آخر میں مشہور ماہر لسانیات پروفیسر واندرییس (مصنف کتاب "زبان۔ لسانی مقدمہ تاریخ") اور ایرانی، عربی اور سنسکرتی زبانوں کے مشہور آفاق لسانیوں پروفیسر بن وے نِست (رکن ادارۂ تحقیقات عالیہ، پیرس یونیورسٹی)، پروفیسر سی یول (پروفیسر عربی قومی مدرسۂ السنۂ مشرقیہ) اور پروفیسر سلون لیوی (پروفیسر سنسکرت کالج دے فرانس) کے اُن مفید مشوروں اور درسوں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کی وجہ سے راقم الحروف کو اُردو زبان کے فارسی، عربی اور سنسکرتی عناصر کے متعلق بصیرت حاصل ہوئی۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت حال واضح ہوگئی ہوگی کہ جو کچھ اس مختصر سی کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ یورپ ہی کے چار سالہ قیام کی کوششوں اور بحث و مباحثہ کا

تمہید

نتیجہ اور انہی متذکرہ اربابِ فن کی توجہ اور دلچسپیوں کا مرہون منت ہو۔ بہت کم بحثیں ہوں گی جن پر ان میں سے کسی نہ کسی سے گفتگو نہ کی ہو۔ لازمی ہے کہ ان کرمفرماؤں کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا جائے کیوں کہ اس سے قبل اس اعتراف کا موقع نہیں ملا تھا۔

(۴)

یورپ سے واپس ہونے کے بعد سے اپنے مقصد کی تکمیل کا خیال برابر قائم رہا کیونکہ عام اردو دانوں کو اس اہم موضوع سے واقف کرانے سے بڑھکر اپنی جماعتوں کے طالب علموں کی یہ دقت روز بروز میری نظروں میں نمایاں ہوتی جا رہی تھی کہ اردو زبان کے آغاز وارتقا اور لسانی تعلقات کی نسبت اردو میں تو کیا انگریزی میں بھی کسی مرتب اور مکمل صورت میں مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ غرض فی الحال یہ چھوٹی سی تعارفی کتاب تیار ہو گئی ہے جس میں جملہ ضروری معلومات کو کم سے کم الفاظ میں پیش کرنے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

ہندستانی کے ماخذ بیان کرنے کے سلسلہ میں ہند آریائی اور پھر ہند یوربی خاندانوں پر بحث کرنی پڑی اور ارتقا کے سلسلہ میں اردو کی ہمہ گیری اور عہد حاضر کے رجحانات اور احتیاجات کے متعلق بھی خیالات قلمبند کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور جب اُردو اور ہندستان کی دوسری زبانوں پر ابواب تیار ہو گئے تو مناسب سمجھا کہ ابتدا میں لسانیات اور زبان سے متعلق چند اصول اور علمی باتیں بطور تعارف کے بیان کی جائیں۔

میں ابھی لکھ ہی رہا تھا کہ مارچ ۳۲ء میں "ہندستان اکیڈمی" کی کانفرنس مقرر

تمہید

ہوئی اور جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کے سلسلہ میں مجھے الہ آباد جانا پڑا۔ وہاں اپنے قدیم کرمفرما اور شفیق ڈاکٹر عبد الستار صدیقی صاحب سے اس بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے اس کو بے حد پسند فرمایا اور اُردو زبان میں اس قسم کی کتاب کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ابھی عرصہ تک تکمیل کو نہ پہنچتی اگر انکی ہمت افزائی اور مفید مشوروں کو دخل نہ ہوتا۔

جب یہ خیال کچھ صورت حاصل کرنے لگا تو میں نے محترمی صدیقی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس موضوع سے متعلق انہی خیالات کو قلمبند فرمادیں جو میری ہمت افزائی کا باعث ہوئے تھے تاکہ میں انھیں اس کتاب کے ساتھ بطور تبرک شامل کر دوں۔ میں بڑا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے میری آرزو پوری کی، اور چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو عالموں اور انشار پردازوں میں وہی سب سے پہلے اور حقیقی عالم لسانیات ہیں اور ہندستان کے ماہرین لسانیات میں خاص وقعت رکھتے ہیں اس لئے اس موضوع پر اُن کی تحریر سب سے پہلے پیش ہونی چاہیئے۔

اس کتاب کی تیاری میں اپنے یورپ کے مطالعہ اور وہاں کے پروفیسروں کے مشوروں کے علاوہ جن ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست آخر میں ایک عنوان کے تحت ملے گی۔ تاہم یہاں ہندستان کے دو مایۂ ناز ماہرین لسانیات پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی اور پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کی لسانی تحقیقات کا تذکرہ ضروری ہو مولانا شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" پہلی اُردو کتاب ہے۔ جس میں ہماری زبان سے متعلق بدیدترین طرز کا لسانی مواد پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر چٹرجی کا مقدمہ "آغاز وارتقائے بنگالی" ور ان کا حال کا لکھا ہوا رسالہ "کلکتہ کی اُردو" دونوں کتابیں ہندستانی السنہ اور ساتھ ہی

تمہید

ہماری زبان کے متعلق نہایت مستند اور عصری معلومات پیش کرتی ہیں۔

(۵)

لسانیات سے متعلق فنی اصطلاحوں کا ترجمہ کرنا آسان کام اور کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ جب سے "دارالترجمہ" جامعہ عثمانیہ کی مجالس وضع اصطلاحات میں شرکت کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور ضرورت میری نظر و ں میں نمایاں ہوگئی ہے اور باوجود روزانہ کی عادت اور مشق کے میں نے اس کام کو سب سے مشکل پایا۔ اگرچہ اپنی بساط کے مطابق ضروری ضروری اصطلاحوں کے ترجمے کر لئے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس ذمہ داری سے کما حقہٗ عہدہ برا نہیں ہو سکا۔ ضرورت ہے کہ اس علم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی ایک چھوٹی سی کمیٹی اس اہم فرض کی انجام دہی کے لئے قائم ہو اور وہ کافی غور و خوض کے بعد لسانیات اور صوتیات کے مستند اور معیاری ترجموں کا اردو زبان میں اضافہ کر سکے۔

آخر میں کتاب کی ترتیب کے متعلق یہ لکھنا ضروری ہے کہ مضامین کی نطرت اور نوعیت کے لحاظ سے اس کو دو حصوں میں منقسم کر دینا پڑا۔ پہلا حصہ عام لسانیات اور السنہ عالم سے متعلق ہے اور دوسرا ہندستانی زبان اور اس کے متعلقہ مسائل سے مخصوص ہے۔ ممکن ہے کہ پہلا حصہ عام طور پر اتنا دلچسپ نہ ثابت ہو جتنا دوسرا ہے، لیکن اردو زبان میں اس قسم کی معلومات منتقل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس بات کی ضرور کوشش کی گئی ہے کہ بے جا طوالت نہ ہونے پائے اور دلچسپی باقی رہ سکے۔

دوسرا حصہ زیادہ اہم ہے اور جدید ترین تحقیقات کی پیداوار ہونے کے باعث

تمہید

غالباً دل چسپی اور غور سے پڑھا جائے گا۔ یہی حصّہ اردو زبان و ادب کے طالبعلموں کی نصابی ضرورتوں کے مطابق لکھا گیا ہے اور توقع ہے کہ اپنی زبان سے دل چسپی رکھنے والے اس پر کافی غور و خوض فرمائیں گے۔

سیّد محی الدین قادری زورؔ

۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء
حیدرآباد (دکن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لِسانیات

مقاصد، فوائد اور تاریخ

مقاصد لِسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے زبان کی ماہیت، تشکیل ارتقاء، زندگی اور وفات کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کائنات اور معاشرت انسانی سے متعلقہ علوم میں لسانیات کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا احساس ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔ فرانس کا مشہور فاضل اِی۔ گوبلو پہلا شخص ہے جس نے کتاب "تقسیم علوم" (مورخہ ۱۸۹۸ء) میں اس علم کی کماحقہٗ تعریف کی اور اس کی اہمیت پر بحث کی۔ چنانچہ اس وقت سے آجتک اس علم کے مقاصد و فوائد اور اصول وضوابط کی نسبت معتدبہ کتابیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔

مغربی ماہرین نے لسانیات کے مقاصد کی وسعت و گوناگونی پر بڑے بڑے مقالے لکھے ہیں۔ لیکن یہاں صرف اِتنا بیان کرنا کافی ہے کہ زبانوں کا تجزیہ، ان کی تاریخ، ان کے باہمی نقابل ارتباط، ان کی معنوی ساخت اور انکی ظاہری تقسیم و گروہ بندی پر غور و خوض کرنا لسانیات کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ چونکہ

زبان لفظوں سے بنتی ہے اس لئے لسانیاتیوں کا تعلق بالعموم لفظوں ہی سے ہوتا ہے وہ ان پر اس لئے غور نہیں کرتے کہ ان کے معانی و مطالب دریافت کریں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تاریخ معلوم کریں۔

جان پیل نے آج سے پچپن برس پہلے ہی (یعنی سنہ ۱۸۶۶ء) میں لکھا تھا کہ "جس طرح کوئی ماہر نباتات پھولوں کا تجزیہ کرتا ہے، ایک لسانیاتی لفظوں کو ٹکڑے کر کے دیکھتا ہے تاکہ معلوم کرے کہ وہ کن اجزا سے مرکب ہیں اور ان اجزا کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے۔ اسی طرح وہ یکے بعد دیگرے ہر زبان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اُن سب کی اسی اسلوب پر تحقیق کرتا ہے اس کے بعد نتیجوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے یہ قرار دیتا ہے کہ فلاں فلاں علیحدہ زبانوں میں کون کونسی خصوصیات مشترک ہیں۔ اور ان میں سے کس کے ساتھ کیا بات مخصوص ہے۔ سب کے آخر میں وہ ان اسباب کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُن زبانوں کی تشکیل میں سرگرم رہے ہیں۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ زبانوں کی زندگی کے ارتقا اور تغیر کی ماہیت سے واقف ہو گیا۔"

ماہرین لسانیات کے اس مطمح نظر سے واقف ہونے کے بعد کوئی شخص یقیناً یہ سوال کر سکتا ہے کہ "آخر ان جھگڑوں سے فائدہ ہی کیا ہے؟ جب میں کوئی زبان سیکھتا ہوں تو میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں گفتگو کر سکوں یا اس کو پڑھ سکوں میں یہ تحقیق کرنا نہیں چاہتا کہ الفاظ کیوں کر بنے؟ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے معنی کیا ہیں؟" اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی زبان کی تعلیم پانے

والے کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے مگر معلوم ہونا چاہیے کہ الفاظ اشیاء کے محض نام ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ خود بھی اشیاء ہیں اور اکثر دفعہ تو نہایت طاقتور اشیاء ثابت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب کے آئندہ صفحات کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔

کتاب "لسانیات" میں پیل اس بحث کی یوں وضاحت کرتا ہے کہ "اگر کوئی شخص ان لوگوں میں سے ہے جو یہ معلوم کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں کہ جنھیں اشیاء سمجھا جاتا ہے وہ اشیاء کیوں ہیں تو وہ یہ معلوم کرکے خوش ہوگا کہ ایک لفظ صرف اس قدر سانس ہی نہیں ہوتا جس کو انسان ایک دوسرے انسان پر اپنا مطلب ظاہر کرنے کے لئے باہر نکالتا ہے۔ بلکہ وہ ایک نہایت ہی اہم چیز ہوتی ہے۔ الفاظ وہ پائدار اشیاء ہیں جن کی پیدائش، ارتقا، زوال اور فنا کی تاریخ ایک ناول سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے، نہ صرف یہی بلکہ طرح طرح کے پُرلطف اور عجیب و غریب طریقوں سے انسانی ذہنیت کے بعض نامعلوم متعلقات اور اسرار کی نسبت معلومات بخشتی ہے۔"

فوائد صرف اساتذۂ السنہ ہی کو لسانیات سے دلچسپی نہیں بلکہ بعض دیگر علوم و فنون کے ماہرین کو بھی اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ نفسیات، فلسفہ، عمرانیات، اور بشریات پر تحقیق و تفتیش کرنے کے سلسلہ میں لسانیات کی مدد کئی طرح سے ناگزیر ثابت ہوتی ہے۔ اور یورپ و امریکہ میں جہاں انسانی ذہنیت اور زندگی کے ہر شعبہ کی جانچ پڑتال کی جارہی ہے۔ اصول و ارتقائے لسانیات سے جگہ جگہ فائدے حاصل کئے جاتے ہیں۔

لسانیات

ماہرین نفسیات ابتدا میں لسانی طرز ارتقا کی طرف زیادہ متوجہ نہیں تھے مگر اب زبانوں کے تجزیہ کی طرف خاص احتیاط و توجہ کے ساتھ مائل ہو گئے ہیں تاکہ انسانوں کی عادت و روایات ہیجات اور عمل تطابق وغیرہ پر کامیابی کے ساتھ روشنی ڈالی جاسکے۔ اس ضمن میں مشہور ماہرین نفسیات جے، آر، کینٹر[1] اور جے، بی، واٹسن[2] کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے زبانوں کے نفسیاتی پہلو پر بحثیں کیں اور لسانیات کو نفسیات کے اُصول و ضوابط کی روشنی میں دیکھنا چاہا۔

فلسفیوں نے بھی اس طرف خاص توجہ کی ہے۔ انھوں نے زبان اور خیال کے باہمی تعلق کے نسبت گہری دل چسپی ظاہر کی۔ اور علم اور تجربوں کی جماعت بندی اور عادتی و روایتی اشاروں کے ساتھ معانی و مطالب کے تعلق پر بحث کرنے کے سلسلہ میں اصولِ لسانیات سے مستفید ہوئے۔ خاص کر کیسررے[3]، دلافوس، آگڈن اور رچارڈ جیسے بلند پایہ فلسفہ دان تو لسانیاتی مسائل میں غیر معمولی انہماک رکھتے ہیں۔ ان کی کوششوں سے نئے نئے نقاط نظر پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے چند فلسفہ اور لسانیات دونوں کے لئے مفید اور اہم ہیں۔

ماہرین عمرانیات اور بشریات کو لسانیات سے اس لئے دل چسپی پیدا ہوئی کہ انسانوں کی اجتماعی خصوصیتوں اور ذہنیتوں کے سمجھنے کے لئے لسانی مسئلہ سب سے

(1) J.R.KANTOR. "Analogies of Psychological Language data."

(2) J.B.WATSON.

(3) CASSIRER, DELAFOSSE, OGDEN, RICHARDS.

پہلے قابلِ غور سمجھا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں آئی، بی مالینووسکی[1] کے وہ خیالات زیادہ قابلِ قدر ہیں جو ابتدائی انسانوں کے لسانی اظہار اور اشاروں سے متعلق ہیں۔ اجتماعیات کے علماء زبان کی قدر و قیمت اس لئے بھی زیادہ کرنے لگے ہیں کہ وہ اجتماعی گروہوں کے اشاریہ یا نمائندہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کے علاوہ جملہ تاریخی تحقیقات میں بھی لسانیات کا مطالعہ عملی طور پر فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ قدیم قوموں کے عادات و اطوار اور رسم و رواج کی نسبت معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قدیم زبان ہے جس کے پراگندہ نمونے ان قوموں کے باقی ماندہ افراد کے سینوں میں صدیوں بعد تک محفوظ رہتے ہیں۔ اور جو لسانیات کی مدد سے منضبط اور منظم ہو کر تشریح حاصل کرتے ہیں۔

مختلف قوموں کی تاریخ اور ماقبل تاریخی حالات کا اندازہ کرنے میں لسانیات سے زیادہ مفید کوئی اور علم ثابت نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر مقامات کے ناموں کی تشریح و تجزیہ ہی کو لیجئے جس کی مدد سے آج یورپ اور مغربی ایشیا کی قدیم ترین تاریخیں مرتب کی جا رہی ہیں۔

تاریخ عام طور پر لسانیات کو ایک جدید علم سمجھا جاتا ہے جو انیسویں صدی ہی کی پیداوار ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ در اصل نہایت قدیم علم ہے جس پر یونان قدیم روما اور اسکندریہ میں کامیاب طریقوں پر غور و خوض کیا جا چکا ہے۔ البتہ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے علوم و فنون کی طرح اس علم نے بھی عہدِ حاضر میں اپنی کینچلی بدل ڈالی ہے۔

---

(1) I.B. MOLINOVSKI.

لسانیات

احیاء علوم (رینے سانس) کے زمانہ تک یورپ میں یہ علم خوابیدہ رہا۔ مگر اس کے بعد ہی فرانس، اٹلی اور جرمنی میں اس کی طرف گہری توجہ منعطف کی گئی۔ اس عہد کی مشہور شخصیتوں نے جنھوں نے لسانیات پر بحث و مباحثہ کیا اور اس کی تحقیق و تفتیش کی، فرانس کے بودے، اٹلی کے لامبیں اور مورے، لودین کے یوسٹس لس پیئس، اور اسکالیجر، اور کیاسوبوں جنھوں نے آخر کار انگلستان میں سکونت اختیار کرلی اور ان کے علاوہ اراسمس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تقابلی لسانیات کی ابتدار اس وقت سے ہوتی ہے جب کہ یونانی اور لاطینی زبانوں کا ایک مشترک ماخذ قرار دینے کے خیالات یورپ کے علماء میں بار بار پیدا ہوئے اور اکثر یہ بات ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں کہ ان کا ماخذ عربی زبان ہے۔ آخر کار ایک انگریز فاضل جونس نے ۱۷۸۶ء میں اپنی لسانی تحقیقات کے نتیجے شائع کئے جن سے لاطینی، یونانی، گوتھک، سنسکرت اور کلٹک زبانوں کے اشتراک ماخذ پر روشنی پڑتی ہے۔

اس کام کو بعد میں فرانس بوپ اور یاکوب گرم نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت سے جدید علم لسانیات کی بنیادیں مستحکم ہونے لگیں

گرم کی اساسی خدمتوں کی وجہ سے آج لسانیات اہم ترین علوم میں شمار کیا جانے لگا ہے اس نے السنہ سے متعلق اپنے زمانے کی خام اور غیر منظم معلومات کی تنقیح اور تشریح کی۔ اور لسانیات کا ایک ایسا قاعدہ اپنی یادگار چھوڑ گیا، جو ہمیشہ اس کے نام سے منسوب رہے گا اور جس نے زبانوں کی حکمی تحقیقات میں جہاں تک ٹیوٹونی زبانوں کا تعلق ہے، ایک انقلاب پیدا کردیا۔" گرمس لا"

لسانیات

پر آج تک متعدد رسائل و مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قابل قدر محسن کے اس انکشاف نے لسانیاتی مسائل کی گہری اور باضابطہ تحقیقات کا دروازہ کھول دیا اور لسانیات کے دوسرے علوم و حکمیات کی طرح معین اور خاص خاص ضوابط مقرر کر دیئے۔

ان لسانیاتی کوششوں کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہوا کہ السنہ عالم کی نہایت صحیح تشریح اور جماعت بندی ہو سکے۔ یہ کام پہلے بالکل ناممکن تھا۔ اگرچہ اب بھی خاص خاص ماہرین لسانیات کے درمیان چند جزوی مسائل کے بارے میں اختلاف ہے لیکن جہاں تک زبانوں کی عام تقسیم اور تجزیہ کا تعلق ہے لسانیات کے اعلیٰ اصول و ضوابط معین کر دیے گئے ہیں۔

مبادی و اصول لسانیات سے متعلق اور جن ماہرین نے تحقیقی اور مفید کام کئے ہیں ان میں سے حسب ذیل علما اور ان کے کارناموں کا ذکر تاریخ لسانیات بیان کرتے وقت نہ کرنا خون انصاف کرنا ہے۔ اوٹو یسپرسن[1] نے اپنی کتابیں، (۱) زبان، اسکی فطرت، ارتقا، اور ماخذ" (۲) فلسفہ گرامر" لکھ کر اس علم کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ جے۔ واندریس[2] نے اپنے کارنامے زبان۔ ایک لسانیاتی مقدمہ تاریخ" کے ذریعہ سر اس پر پائدار احسان کئے ہیں۔ اسی طرح اسی۔ ساپر[3] کی کتاب" زبان دیباچہ مطالعہ گفتگو"

---

(1) OTTO JESPERSEN Language, its Nature-Development and Origin 2. Philosophy of Grammer

(2) J. VENDRYES Le Langue,

(3) E. SAPIR, Language-An Introduction to the study of Speech.

لسانیات

لسانیات کا ایک شاہ کار سمجھی جاسکتی ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ ان سب مصنفین کا موضوع ایک ہی ہے۔ ہر شخص کا نقطۂ نگاہ جدا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ ایک کتاب دوسری کا ضمیمہ ہے۔

یسپرسن زیادہ تر یورپ کی اہم ترین جدید زبانوں پر نظر رکھتا ہے اور اپنی تحقیقات میں اکثر انہی دل چسپی پیدا کرنے والے اُمور پر بحث کرتا ہے جن کو عام طور پر دوسرے لسانیاتی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ واندریس کا نقطۂ نگاہ ذرا وسیع ہے اس کا موضوع ہندیورپی زبانیں ہیں اور وہ زیادہ تر زبانوں کے تاریخی اور تقابلی پہلوؤں پر زور دیتا ہے۔ ساپر امریکی انڈین زبانوں کا مخصوص ماہر ہے وہ خاص کر زبان کے نفسیاتی اور خارجی اصول و مسائل میں دل چسپی رکھتا ہے۔ اس کی تحریریں بالعموم قدیم اقوام کی زبانوں کی مثالوں اور نمونوں سے مالا مال ہوتی ہیں۔

ان چند مصنفین کے علاوہ اور کئی ماہرین لسانیات ایسے ہیں جن کے نام یہاں گنائے جاسکتے ہیں۔ مگر چونکہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو لسانیات کے خاص خاص شعبوں میں کام کر رہے ہیں اور جنھیں اصول و مبادی لسانیات سے زیادہ تعلق نہیں اس لئے ان کا ذکر انہی خاص بحثوں میں کیا جائے گا۔ جن میں ان کے خیالات اور تحقیقات سے ہم نے استفادہ کیا ہے۔

زبان

ماہیت، آغاز اور تشکیل

ماہیت زبان خیالات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ اس ترجمانی میں وہ حرکات جسمانی بھی شامل ہیں جو کسی مفہوم کے سمجھانے کے لئے خاص خاص زبان بولنے والوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں۔

یہاں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ماہرین لسانیات زبان کی تعریف کرتے وقت صرف اسی جملے پر اکتفا نہیں کرتے کہ وہ خیالات کو خوبی کے ساتھ دوسروں پر واضح کر دینے کا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ یہ مقصد تو اور ذریعوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً حرکات جسمانی یا اشارے جن سے گونگے یا وہ لوگ اپنا مطلب ادا کرتے ہیں جنھیں کسی غیر زبان بولنے والی قوم سے سابقہ پڑتا ہے اگر آپ جانے کے ارادہ سے کرسی سے اُٹھیں اور آپ کا دوست ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کرے تو کیا اشارہ اس جملے کی نیابت نہیں کرے گا کہ "بیٹھیے"۔ اور اگر آپ اپنا سر یا مونڈھے ہلا دیں تو کیا آپ کا دوست بغیر کہے نہیں سمجھ جائے گا کہ آپ کو بیٹھنے سے انکار ہے؟ فرانسیسی افراد اپنے اشاروں اور حرکات جسمانی سے وہ کچھ سمجھا دیتے ہیں جو ہم ان کے جملوں سے بھی نہیں سمجھ سکتے۔

دوسرا ذریعہ جس سے ایک انسان دوسرے پر اپنے خیالات ظاہر کرتا ہے۔ نقش کاری اور مخطوطہ اشارے ہیں جو مختلف موقعوں پر مستعمل ہوتے ہیں اور خاصکر گونگوں اور سیاحوں کو مدد دیتے ہیں لیکن محض ان کی مدد جملہ انسانی کاروبار کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیالات کی ترجمانی کے لئے نطق یا قوّت گویائی ہی ایک مکمل ترین اور سب سے زیادہ واضح ذریعہ سمجھی جاتی ہے اور اس بنا پر یہ مقولہ عام طور پر رائج ہو گیا ہے کہ "قوّتِ گویائی ہی انسان اور حیوان کے درمیان باعثِ امتیاز ہے"۔

پس زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوّت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہو اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے دُہراسکتا ہے۔

زبان کیونکر پیدا ہوئی "انسانی خیالات اور احساسات کے لئے زبان کیونکر پیدا ہوئی"۔ یہ مسئلہ معرکۃ الآرا ہے اور نہایت دلچسپ۔ زبان کے آغاز یا دوسرے الفاظ میں دنیا کے اہم لسانی خاندانوں کے آغاز پر تحقیق و تفتیش کرنے کے لئے آج بہت کم مواد موجود ہے کیونکہ بعد کے زمانہ کے حالات اور ارتقائی واقعات نے ابتدائی شکلوں پر ایک ایسا پردہ ڈال دیا ہے جس کا دور کرنا عہد حاضر کے محققین کے بس کی بات نہیں۔ دُنیا کی مختلف لسانی شاخیں اپنی جدا جدا اور آزاد خصوصیتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے اس قدر دور ہیں کہ انھیں ایک ہی ابتدائی خاندان کے مشتقات قرار دینا

زبان

آج قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام مختلف اور جُدا جُدا نسلوں کے قسم قسم کی خصوصیتیں رکھنے والے افراد میں ایک ہی فطرت انسانی کام کر رہی ہے۔ تو پھر یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مختلف خاندان السنہ ہی ایک ابتدائی زبان یا ایک ہی ابتدائی قبیلہ کی بولی سے متفرع ہوئی ہیں۔

زبان کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے کہ وہ صرف انسان ہی کو حاصل ہے اور جاہل سے جاہل بلکہ وحشی سے وحشی قبیلوں کے انسان بھی گفتگو کر سکتے ہیں، حالانکہ دوسرے حیوانات خواہ ان کی فہم و استعداد کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو۔ گفتگو نہیں کر سکتے۔ یہ امتیاز ظاہر کرتا ہے کہ تکوین عالم کے وقت پروردگار نے اسی طرح ہم میں بات چیت کرنے کی اہلیت پیدا کی جیسا کہ اس نے ہم میں سانس لینے، چلنے پھرنے اور کھانے پینے کی قابلیت عطا کی۔ یہاں سوال صرف اس قدر باقی رہ جاتا ہے کہ آیا ہم نے اسی طرح گفتگو کرنا شروع کر دیا جس طرح سانس لینے لگے تھے یا جیسا کہ ہمارے جسم میں خون دورہ کرنے لگا تھا، یا اس طرح جیسے کہ ہم حرکت کرتے یا کھاتے پیتے یا اپنے جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے کپڑوں کا استعمال کرتے ہیں۔

پہلی قسم کے طریقۂ کار میں ہماری مرضی اور ارادے کو دخل نہیں ہے اسکے برخلاف دوسرے کام انسانی طبعی قوتوں کے بالارادہ استعمال کے نتیجے ہیں جنہیں ہم خدائے تعالےٰ کی عنایت کی ہوئی قابلیتوں کے ذریعہ اور مدد سے اپنی فطری احتیاجات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ماہرین السنہ کا زیادہ تر رجحان اِسی آخری طریقہ کار کی طرف ہے۔ کیوں کہ

زبان

زبانیں آج اتنی مختلف نہ ہوتیں اگر بولنے والے اپنی جدا جدا ضرورتوں اور اہلیتوں کے مطابق خود ان میں ترقی اور تغیر و تبدل نہ کرتے۔ اس کے علاوہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس طرح غیر ارادی طور پر سانس لینے لگتا ہے۔ اسی طرح گفتگو نہیں شروع کر دیتا۔ اگرچہ اس میں پہلے ہی سے پروردگار نے گفتگو کرنے کی قابلیت ودیعت کر دی ہے۔

غرض انسان میں کام لینے کی استعداد اس کی خاص فطرت کی طرح یقیناً ایک ودیعت الٰہی ہے۔ مگر زبان اس حد تک انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ اس خداداد قابلیت کو اپنی فطرت اور عضوی خصوصیات کی مدد سے ظاہر کرتا ہے۔

زبان کا ارتقا زبانوں کی تشکیل اور ارتقا براہِ راست انسانی خیالات کی تشکیل اور ارتقا پر منحصر ہے اور زبان کی تفہیم ملفوظہ آوازوں کے علاوہ انسانی خیالات اور احساسات پر بھی مبنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فہم انسانی اور نطقِ انسانی کے نفسیاتی قوانین بھی ایک دوسرے سے بالکل متعلق ہوتے ہیں۔

زبان اور انسانی سوچ بچار کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔ سوچنا در اصل اپنے ذہن میں گفتگو کرنا ہے اور زبان اس اندرونی گفتگو کی ترجمانی کرتی ہے، اسکو شکل پہناتی ہے، خاص خاص ذہنی اشاروں کے ذریعہ سے معین کرتی ہے اور ساتھ ہی اس کو آسان بھی بناتی ہے۔ موہوم ذہنی پیکر تراشیوں کو واضح اور معین کرنا کچھ کم خدمت نہیں ہے۔

کسی شخص کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کے خیالات کو جوں کے توں

نہیں ظاہر کر دیتے بلکہ انھیں ایک شکل کے توسط سے نامکمل اور عمومی حالت میں پیش کرتے ہیں۔ کسی لفظ یا فقرہ کے سمجھ لینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ لفظ یا فقرہ جس چیز کی ترجمانی کرتا ہو اس کی ایک ہو بہو شکل نظروں کے سامنے آگئی۔ بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ سمجھنے والا ان تمام گوناگوں رجحانات سے واقف ہو گیا یا ان کی نسبت اس میں ایک طرح کی بیداری کا احساس پیدا ہو گیا جو ان اشیاء کا دیکھنا یاد دلاتے ہیں جن کی الفاظ یا فقرہ نے ترجمانی کی ہے۔

لفظوں کی تشکیل اگر لفظوں کی تشکیل کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ کسی انسان کے ارادہ کی پیداوار ہوں یا خود ہی کسی وجہ سے بن گئے ہوں ہر حال میں انسانی ذہن اور قوت متخیلہ نے ان کی تشکیل میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کسی چیز کے نام کے لئے ایک ایسا لفظ یا اس کے مشتقات استعمال کئے جاتے ہیں جو پہلے اس سے کسی نہ کسی طرح ملتی جلتی چیز کے لئے اختیار کئے گئے تھے۔ یہ فعل اس واقعہ کا نتیجہ ہے کہ انسانی دماغ میں اس شے کے دیکھنے کے بعد گزشتہ کی ایک ایسی شکل منعکس ہو جاتی ہے جس کو اس نے کچھ نہ کچھ نام دے رکھا تھا اور اس انعکاس کے ساتھ ہی اسکے متعلق کوئی لفظ بھی ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے جو اس ابتدائی نام سے زیادہ دور نہیں ہوتا۔ فارسی اور اردو الفاظ "نَے" اور "بانسلی" جو ایک خاص آلہ موسیقی کے نام ہیں اس نباتی اشتراک اصلیت کا نتیجہ ہیں جو جنگل کی نے اور بانس کے ساتھ ان مخصوص اصطلاحوں کو حاصل ہے۔

اسی قسم کی لفظی تشکیل میں "بسمل" اور "سبحہ" جیسے الفاظ بھی شامل ہیں جو واضح کرتے

ہیں کہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کرنا اور سبحان اللہ کا ورد کرنا ان خاص ناموں کی تخلیق کا باعث ہے۔ اسی طرح بہت سی چیزوں کے نام ابتدا میں اپنے وطن یا اپنے بانی کے نام کی نسبت سے تخلیق پاتے ہیں۔ اگرچہ آج انھیں زبان میں ایک بالکل آزاد حیثیت حاصل ہے۔ "مصری" جو شکر کی ایک خاص قسم یا شکل کا نام ہے یا "چینی" جو ایک طرح کا مرکب ہے جس سے برتن بنتے ہیں یا "طفیلی" وہ شخص جو کسی کے ساتھ بن بلائے مہمان چلا جاتا ہے اور اس طرح کے سینکڑوں اردو لفظ اسی قسم کی لفظی تشکیل کے تحت عالم وجود میں آئے۔

یہ تمام مثالیں واضح کرتی ہیں کہ تشکیل الفاظ میں انسان کے گذشتہ اور موجود ہر طرح کے خیالات کا تعلق کس قدر اہم ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ لفظ اپنی پیدائش کے لحاظ سے انسان کا ایک خود اختیاری یا روایتی اشارہ ہے جس سے واقف ہوتے ہی کسی شخص کے ذہن میں وہی خیال یا خیالات رونما ہو جاتے ہیں جن کو وہ شخص عادتاً یا درانستاً اس لفظ کے سننے کے بعد پیدا کرتا رہتا ہے مگر عام ذہنوں میں جو خیال یا تصویر کسی لفظ کے سننے کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ معین اور تفصیلی نہیں ہوتی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک عالم یا ماہر لسانیات کی نظر میں لفظوں کی صرفی و نحوی ترکیب، ان کی معنوی وسعت یا محدودیت یا ان کی تاریخی اور ارتقائی حالت کے لحاظ سے ان کے معنی خاص اور معین ہوں۔ مگر عام طور پر الفاظ اپنی انفرادی حالت میں نامکمل ہوتے ہیں اور جب وہ جملوں یا فقروں میں منسلک ہوتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی قدر و قیمت اور ان کی پیش کی ہوئی ذہنی تصویریں بالعموم نسبتی اور غیر معین ہوتی ہیں۔ غرض لفظ اور خیال کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہ ہمیشہ استوار اور یکساں نہیں ہوتا۔

زبان

لفظوں کے مفہوم دنیا کی کسی زبان میں نہیں دیکھا گیا کہ کوئی ایک لفظ ہمیشہ کے لئے صرف کسی ایک ہی خیال کے لئے وقف ہو گیا ہو۔ تمام الفاظ اپنی قدر و قیمت میں موقع و محل کے لحاظ سے تبدیلی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اکثر دفعہ ایک ہی لفظ اپنے ماسبق اور مابعد کے لفظوں کی تبدیلی کی وجہ سے اپنا مفہوم بالکل بدل دیتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ صرف لفظ "قطعہ" کو لیجئے اور دیکھیے کہ ایک شاعر اسکا کیا مفہوم لیتا ہے، کسی گاؤں کے پٹیل۔ پٹواری یا کسی ہراج کرنے والے ایجنٹ کے یہاں اس کے کیا معنی ہیں اور کسی خوشنویس کی نظر میں وہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔ کسی کو اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قطعہ کے معنے ہیں ٹکڑے کے۔ مگر معنے بتاتے وقت بہت کم حضرات اس وسیع فرق کو محسوس کرتے ہیں جو یہی لفظ ذیل کے تین مختلف جملوں میں پیدا کرتا ہے۔

۱۔ زمین کا یہ قطعہ فروخت ہو گیا۔
۲۔ شادی کی مبارکباد ایک فصیح و بلیغ قطعہ کی شکل میں تحریر کی۔
۳۔ قدیم عہد کا ایک پاکیزہ قطعہ کمرہ کی زینت تھا۔

ظاہر ہوا کہ الفاظ میں اس امر کا رجحان ہر وقت موجود ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی فنی، عادتی، شخصی اور قومی غرض ہر نئی فضا میں ایک نیا مفہوم واضح کریں۔ ایک ہی لفظ ایک ہی قسم کا معیار زندگی رکھنے والے کے یہاں ایک معنی دیتا ہو اور دوسرے کے یہاں دوسرے۔ مثلاً اُردو کے ایک فعل "اُتارنا" پر غور کیجئے۔ معلوم ہو گا کہ جتنی قسم کے آدمی ہیں اور جتنی طرح کے کام ہیں اتنے ہی مختلف پہلو اس خیال میں موجود ہیں جو لفظ "اتارنا" کے ملفوظ ہونے کے بعد کسی شخص کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں

زبان

کیا حسب ذیل افعال میں لفظ "اُتارنا" سے ہر جگہ ایک ہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔؟

چربہ اُتارنا۔ کپڑے اُتارنا۔ نقل اُتارنا۔ دیوار اُتارنا۔ سواریاں اُتارنا۔ قبر میں اُتارنا، بوجھ اُتارنا۔ چُھدا اُتارنا۔ رجسٹر میں نشان اُتارنا۔

غرض زبان کی تشکیل اور اس کے مفہوم کا تغیر و تبدل منحصر رہتا ہے خیالات پر۔ اور جیسے جیسے خیالات میں تبدیلی یا کمی بیشی ہوتی ہے۔ اسی کی مناسب زبان کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔

فطری ارتقاء

صوتی تغیر و تبدل، ادغامی اثرات

زمان و مکان کے حالات کے مطابق زبان خود بخود بدلتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کو ماہرین لسانیات زبان کا فطری ارتقا قرار دیتے ہیں۔ اس ارتقا کا انحصار زیادہ تر صوتی تشکیل اور تغیر و تبدل پر ہوتا ہے۔

صوتی تغیرات تاریخ السنہ میں صوتی تبدیلیوں اور ارتقا کو اس لئے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ زبان کی دوسری اکثر تبدیلیاں اور ارتقا کم و بیش اسی کے تحت ہوتے ہیں اور جو حالات تلفظ اور لب و لہجہ میں تغیر پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق و تفتیش اکثر دفعہ دلچسپ ثابت ہوتی ہے۔

صوتی تبدیلیوں کی سب سے پہلی اور اہم وجہ عضویاتی ہے۔ ایک نسل دوسری نسل کے لئے جو لسانی ورثہ چھوڑ جاتی ہے وہ بعینہٖ ایک اور زمین نہیں ہوتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر نسل کے بعد اس کی آوازیں اور اس کے عضوی عادات و اطوار غیر محسوس طور پر کچھ نہ کچھ تبدیل پاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اکثر نتیجہ ہوتی ہے۔ ہمسایہ زبان کے اثر کا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی ایک نسل کو ایک اجنبی زبان کو بولنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اس اجنبی زبان کی آوازیں اس نسل کے اپنے لفظوں پر جو عمل یا ردعمل کرتی رہتی ہیں ان کے نتیجہ کے طور پر اس تمام نسل کے مخارج تلفظ آہستہ

آہستہ اپنی جگہوں سے ہٹنے لگتے ہیں۔ یہ محض خیال نہیں ہے۔ اس کی واقعیت کا عملی ثبوت اس طرح بہم پہنچتا ہے کہ ایک ایسے نوجوان کی گفتگو صوتی گراموفون پر اتاریں جس نے اپنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کی بھی تحصیل کی ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کے کسی معمر عزیز سے بھی وہی جملہ کہلائیں (مگر شرط یہ ہے کہ اس دوسرے شخص کی زبان پر کسی اور زبان کا اثر نہ پڑا ہو۔) تو آپ معلوم کریں گے کہ دونوں کے مخارج میں ایک معین فرق پیدا ہو گیا ہے۔

یہ تو ایک جدید عملی ثبوت کا ذکر تھا۔ اس کے تاریخی ثبوتوں سے خود ہماری اردو زبان محروم نہیں ہے۔ آپ صرف اردو حرف جر "سے" لے لیجئے اور دیکھئے کہ زمانہ اور نسلوں کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال نے بھی کیا تغیر حاصل کئے ہیں۔ لفظ "سے" کی موجودہ شکل اردو زبان میں صرف سوا سو سال ہی سے مستعمل ہے اس سے پہلے یہ لفظ سیں یا سوں کی شکل میں رائج تھا۔ چنانچہ ولی اور اس کے ہم عصروں کے کلام میں آپ کو ہمیشہ سیں یا سوں نظر آئے گا۔ ولی کا مشہور شعر ہے ؎

مت غصہ کے شعلوں سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا

ولی سے تقریباً پچاس سال قبل یہ لفظ "ستے" اور "ستیں" کی شکل میں رائج تھا چنانچہ قطب شاہی سلطنت کے عہد آخر کے شاعروں کا کلام اس کا شاہد ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ اور اورنگ زیب کے معاصر غلام علی کی نظم پدماوت کا ایک مصرعہ ہے۔ ؎

"بھلائی ستے تو بھلا پائے گا"

غلام علی سے پچاس سال قبل، اس لفظ میں "س" کی آواز موجود نہیں تھی۔ اس

زمانہ کے گولکنڈہ کے بسنے والے "مجھ سے کہا" کی جگہ "مج تھے کہیا" کہتے تھے۔ چنانچہ مشہور قطب شاہی بادشاہ محمد قلی اور اس کے درباری شعرا کے کلام میں لفظ "تھے" ہی نظر سے گزرتا ہے۔ محمد قلی کے مصرعے ہیں:۔

۱۔ "معانی کے باتاں تھے جھڑتا نمک"

۲۔ "مرا گلستاں تازہ اس تھے ہوا ہے"

محمد قلی کے عہد سے پہلے اور غالباً گولکنڈہ کی تعمیر کے وقت بھی یہ لفظ "تے" کی شکل میں رائج تھا۔ وجہی جس نے ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ سے شاعری میں شہرت حاصل کرلی تھی۔ اکثر "تے" لکھتا ہے۔ مثلاً ع۔

"تج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا"

وجہی سے پہلے تمام اردو تحریروں میں "تے" ہی ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے جو اردو نثر منسوب ہے اور جو ان کی نہیں تو ان کے قریبی زمانہ کی ضرور ہے اُس میں بھی "تے" ہی لکھا گیا ہے مثلاً "معراج العاشقین" کا ایک جملہ ہے "اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی انچ تے میں جلوں"۔

اس وقت تک جس کتاب کو اُردو زبان کی قدیم ترین نظم سمجھا جاتا ہے وہ میاں خوب محمد گجراتی کی خوب ترنگ ہے۔ اس میں اس حرف جر کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ مگر چند مقامات پر حرف "تھیں" استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً :۔ غیرت تھیں سب کیا قبول۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ لفظ "سے" کی صوتی شکل مختلف زمانوں اور مقامات پر بدلتی گئی اور جو لفظ دراصل پہلے تھیں یا تے تھا وہ تھے، ستے، سیتی، سوں اور سیں،

ہوتا ہوا آخر کار "سے" بن گیا اور ابھی نہ معلوم آگے چل کر اس کا کیا حشر ہو؟

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ نئی پود اپنے آباؤ اجداد کے کسی خاص تلفظ کو ادا کرنے سے قاصر بھی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس امر کے ثبوت موجود ہیں کہ زمانۂ سلف میں کسی حرف کا ایک خاص تلفظ تھا جب بعد میں چل کر وہ آواز ہی غائب ہو گئی تو اس حرف کے تلفظ کے لئے زبان کی موجودہ آوازوں میں سے کوئی آواز کام دینے لگی۔ خود ہماری زبان میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں جن میں کی ایک خاص آواز آج ملفوظ نہیں ہوتی۔ قدیم برہمنی دور میں اس کا ایک خاص تلفظ تھا مگر موجودہ ہندوستانی بالعموم اس کے بولنے سے قاصر ہیں۔

یہ حرف "رِی" (ऋ) ہے جو الفاظ "کرشنا" اور "گھرتم"۔ (لفظ گھی کی قدیم شکل) میں موجود ہے۔ اور آج بالعموم حرف صحیح "ر" کی طرح ملفوظ ہوتا ہے حالانکہ یہ اصل میں ایک حرف علت تھا۔ ہمارے اردو لفظ "گھی" میں وہ "ی" بن کر رہ گیا اور "کرشنا" میں "ر" بن کر۔

ادغامی اثرات

اکثر دفعہ یہ ہوتا ہے کہ کسی حرف کا تلفظ پورا نہ سننے کی وجہ سے بولتے وقت وہ غلط طریقہ پر ادا کیا جاتا ہے اس قسم کے تلفظ کا اثر بالعموم کمزور آوازوں اور خاص کر حروف علت پر پڑتا ہے جو یا تو اسی حالت میں باقی نہیں رہتے یا لفظوں میں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اردو الفاظ لالٹین (لانٹرن)، فلالین (فلانل)، اور لمبر (نمبر) کی تشکیل اسی اثر کے تحت عمل میں آئی ہے۔

صوتی ارتقا اور تبدیلیاں نہایت باضابطہ ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہو کہ ماہرین لسانیات زبانوں کے متعلق متعدد اٹل قوانین و قواعد بنا سکے۔ مثلاً آج آریائی لسانیات

کے ماہرین جانتے ہیں کہ سنسکرت کا ابتدائی حرف "و" اردو، بہاری، بنگالی اور اڑیا زبانوں میں بالعموم "ب" کی شکل میں منتقل ہو گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اردو کے اکثر الفاظ کا ابتدائی حرف "ب" پہلے "و" تھا۔ مگر صوتی ارتقاء و تبدیلی کے تحت آج "ب" بن گیا۔ اس قسم کے چند اردو اور ان کے اصل سنسکرت الفاظ کی مثال یہ ہے:۔

اُردو	سنسکرت	اُردو	سنسکرت
باٹ	وَرُتم	بیس	ویمشتی
بن	وَنَم	بیت	ویتر
بڑ	وَٹَ	بالو	والوکَ

ہم اوپر معلوم کر آئے ہیں کہ ایک ہی زبان ایک ہی حصّہ ملک کے کسی خاص زمانہ کے بولنے والوں میں جن خصوصیات کے ساتھ مستعمل رہے گی اسی حصّہ ملک میں کسی دوسرے زمانے میں نہیں رہے گی۔ اسی طرح ایک حصّہ ملک کے باشندے اسکو جس طرح بولیں گے دوسرے حصّہ کے اسی عہد کے رہنے والے نہیں بولیں گے۔

اُردو زبان میں متعدد لفظ ایسے موجود ہیں جن میں دو دفعہ کوزی (رنٹرو فلکس) آوازیں آتی ہیں۔ ایک ابتدا میں اور ایک لفظ کے درمیان میں مثلاً :۔ "ٹاٹ ٹکڑا، ٹوٹنا، ٹھنڈا، ڈانٹ وغیرہ" مگر انہی اور اس قسم کے اور لفظوں میں اصل زبان میں پہلے کوزی (رنٹرو فلکس) آواز نہیں تھی۔ بلکہ دندانی تھی۔ چنانچہ یہ اصل خصوصیت دکنی اردو میں ابتک موجود ہے۔ دکن میں انہی لفظوں کو تاٹ، تکڑا، توٹنا، تھنڈا اور دانٹ کہتے ہیں۔ اور اس سرزمین میں یہ خصوصیت اس شدت سے باقی ہے کہ اگر اب بھی کسی اجنبی زبان سے کوئی نیا لفظ ایسا مل جاتا ہے جس میں

ابتدائی حرف کوزی (زنٹرو فلکس)، ہے تو دکنی اُردو میں اس کی ابتدائی آواز دندانی ہوجاتی ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ ٹکٹ کو دکنی عوام تکٹ کہتے ہیں۔

شمال کی زبان میں یہ ابتدائی دندانی آواز کوزی (زنٹرو فلکس) میں کیوں تبدیل ہوئی۔ اس کا سبب غالباً نفسیاتی ہے۔ "ٹ" بمقابلہ "ت" کے ایک سخت آواز ہے اور سخت آواز کے تلفظ کے لئے اعضائے مخارج پہلے ہی سے تیار ہوجاتے ہیں چنانچہ ماقبل کے حرف پر اس تیاری کا اثر پڑتا ہے۔ اس کی توضیح کے لئے ادغامی اثر کی یہ مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ اگر کسی لفظ میں مصیتی اور غیر مصیتی دونوں آوازیں یکے بعد دیگرے آئیں تو اگر مابعد کی آواز مصیت ہو اور آگے کی غیر مصیت جیسے لفظ اکبر اور اخبار میں ہیں تو ماقبل کی غیر مصیت آواز بھی خصوصیت حاصل کرلیتی ہے۔ چنانچہ اکبر کا "ک" اور اخبار کا "خ" قریب قریب "گ" اور "غ" بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ماقبل کی آواز مصیت اور مابعد کی غیر مصیت ہو تو ماقبل کی آواز بھی غیر مصیت ہوجاتی ہے۔ مثلاً "آج تک" اور "بازپرس" میں "ج" اور "ز" دونوں مصیت ہیں۔ لیکن اگر آپ انھیں کسی صوتی گردونہ پر کھلوائیں تو معلوم کریں گے کہ "ج" اور "ز" کی آوازیں "چ" اور "س" کی طرح نکلتی ہیں۔

صوتی تبدیلیوں کی قسمیں صوتی تغیر و تبدل سے متعلق ایک اور خاصیت بھی ہے جو زبانوں کے ارتقا میں کسی نہ کسی طرح عمل کرتی رہتی ہے۔ ہر زبان میں آپ کو ایسے لفظ ملیں گے جب کہ تلفظ میں نہایت سُرعت کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ انہی کے ساتھی دوسرے لفظ ابھی زیادہ بدلنے نہیں پائے ہیں۔ ان غیر طبعی تبدیلی حاصل کرنے والے الفاظ میں اکثر

وہ ہوتے ہیں جو کسی کو مخاطب کرنے کے لئے یا آداب و روایات معاشرت یا روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے کثرت سے بولے جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی بے تکلف گفتگو میں لفظ مولوی کے تلفظ پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ لفظ صوتی تبدیلیوں کی دو منزلیں طے کر چکا ہے۔ یعنی مولی، سے ملی۔ پہلی منزل میں ہی دوسرا "و" اڑ گیا۔ اور دوسری میں پہلا۔ اسی طرح انگریزی لفظ "اسٹیشن" عوام کی زبان میں پہلے "اشٹیشن" ہوا۔ اور پھر ابتدائی "ا" اور "ش" اڑ کر "ٹیشن" رہ گیا اور اب تو بعض جگہوں پر لفظ "ٹھیسن" بھی سنا جاتا ہے۔

اسی قسم کی اور صوتی تبدیلیاں بھی ہیں جن میں اگرچہ لفظ کے معنی اور ایک حد تک شکل بھی قریب قریب وہی رہتی ہے۔ مگر یہ تبدیلیاں نہ تو کسی باضابطہ صوتی اصول کے تحت عمل میں آتی ہیں اور نہ زبان کے اس قسم کے جملہ الفاظ پر حاوی ہوتی ہیں۔

اس قبیل کی ایک تبدیلی یہ ہے کہ قریب المخرج حروف صحیح ایک دوسرے کی شکل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ جیسے غالب نے نمبر کو لمبر لکھ دیا جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ اسی طرح لفظ "بیرسٹر" کا تلفظ "بیلسٹر" بھی کیا جاتا ہے۔ یا کاغذ" کو "قاغذ" کہتے ہیں۔ "سرشار" کو شرشار، شمس الدین کو شمش الدین اور سٹیشن کو شٹیشن کہنا بھی اسی صوتی طریقہ عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری مثالوں پر غور کرنے سے آپ معلوم کریں گے کہ یہ تبادلہ ہمیشہ قریب المخرج حروف ہی کے درمیان عمل میں آتا ہو حروف "ن" "ز" اور "س" کے تلفظ کے لئے تالو پر زبان جن حصوں کو مس کرتی ہے۔ وہی حصے "ل" اور "ش" کی آوازوں کے اظہار کے لئے آلودہ ہوتے ہیں۔

ایک صوتی تبدیلی اس طرح کی بھی ہوتی ہے کہ بعض لفظوں میں آوازیں اپنی

ترتیب بدل دیتی ہیں۔ اس قسم میں وہ الفاظ شامل ہیں جو اگرچہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہیں۔ مگر ان میں کوئی نئی آواز یا حرف بھی داخل نہیں ہوا۔ مثلاً لفظ رجحان کا تلفظ رجحان، فصیل کا صفیل، مطلب کا مطبل، کیچڑ کا چیکڑ کیا جاتا ہے۔ یا یہاں کو ہیاں اور وہاں کو ہواں کہا جاتا ہے۔ ان تبدیل شدہ شکلوں میں آپ کو نیا حرف ایک بھی نظر نہیں آئے گا۔ حروف وہی ہیں مگر ترتیب وہ نہیں ہے۔

مگر ان تبدیلیوں میں اور ارتقائے زبان کی باضابطہ اور غیر محسوس تبدیلیوں میں فرق ہے ان متذکرہ بالا مثالوں کو ہم کسی اصول و قاعدہ کے تحت نہیں لا سکتے۔ یہ محض اتفاقی اور ہنگامی واقعہ کا نتیجہ ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اگر آپ اردو الفاظ "کوڑی" اور "مچھلی" پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سنسکرت الفاظ "کپَرد" اور "متسیہ" سے مشتق ہیں۔ یعنی کوڑی کے حروف "ڑ" اور "و" آج قائم مقام ہیں "کپَرد" کے حروف "رد" اور "پ" کے ان کا لسانیاتی ارتقا یوں ہوا۔

کپَرد، کپڈ، کوڈ، کوڑا اور کوڑی۔

اسی طرح متسیہ سے باضابطہ صوتی اصولوں کے تحت لفظ "مچھلی" کا ظہور ہوا۔ اور یہ تبدیلیاں محض انہی الفاظ تک محدود نہیں ہیں۔ جہاں سنسکرت میں "رد" کی آواز تھی۔ آج اکثر اردو میں "ڑ" ہے۔ اسی طرح "پ" کی آواز "و" میں اور "ت" "س" کی آواز "چھ" میں منتقل ہو گئی۔

زبان کے اس فطری ارتقا کے سلسلہ میں ان سماعی الفاظ کا ذکر بھی ضروری ہے جو زبان کے کسی موجودہ لفظ کو دیکھ کر اس کے ہم شکل بنا لئے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں بنانے والوں کے ارادہ و اختیار کو دخل نہیں۔ زبان استعمال

کرنے والے غیر محسوس طریقہ پر الفاظ بناتے اور استعمال کرنے لگتے ہیں۔ یہ نئے الفاظ زبان کے موجودہ لفظوں سے شکل و شباہت اور صوتی عناصر میں اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ بنانے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں جو پہلے زبان میں موجود نہیں تھا۔

اِرادی تشکیل

عوام کا حِصّہ، عالموں کا اثر، وضع اِصطلاحات

عوام کا حِصّہ زبانوں کی ارادی تشکیل عموماً دو ذریعوں سے عمل میں آتی ہے ایک ذریعہ عوام کا ہے اور دوسرا عالموں اور انشارپردازوں کا۔
عوام زبان کی تخلیق یا تشکیل میں دراصل اپنی مرضی یا ارادہ سے حصّہ نہیں لیتے۔ حالات وواقعات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنے لفظی خزانے میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ اکثر دفعہ محسوس بھی نہیں کر سکتے کہ یہ اضافہ کس طرح عمل میں آرہا ہے۔ مگر چونکہ زبانوں کا یہ تغیر وتبدل اور حذف واضافہ ان کی اپنی لسانی یا صوتی خصوصیتوں کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ عوام کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور تغیر وتبدّل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عمل فطری تشکیل نہیں کہلاتا۔

اگر کسی ملک میں دو زبانیں ساتھ ساتھ رائج ہوں یا اگر کسی جگہ کی سرکاری اور دفتری زبان رعایا کی عام بولی کے مقابلہ میں ایک جُدا علمی وادبی زبان ہو تو لسانی تغیر ضرور نمایاں ہوں گے۔

عوام کی زندگیوں کی تاریخ میں بعض ایسی واضح مثالیں نظر سے گذرتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ زبانوں کے تغیر وتبدّل ممالک کے سیاسی انقلابوں کا نتیجہ بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً عربوں کے حملہ نے مصر کی اصلی زبان کو اس قدر مسخ کر دیا کہ آج تمام مصر کی

زبان عربی ہے۔ عربوں کی یورش نے اسی طرح ایران کی زبان کو بھی متاثر کیا۔ اسلامی فتوحات کے بعد ایرانیوں نے نہ صرف اپنا قدیم رسم الخط بدل دیا بلکہ ہزاروں عربی الفاظ اپنی زبان میں داخل کر لئے۔

چونکہ ایسے سیاسی انقلاب بہت کم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی مکمل لسانی تبدیلی بھی تاریخ عالم میں بہت کم پائی جاتی ہے۔

سیاسی اثرات زبانوں کی تشکیل پر اثر کرنے والا دوسرا واقعہ سرکاری اور عوام کی بولیوں کا جدا جدا ہونا ہے۔ اگر ایک زبان کی متعدد بولیوں میں سے کوئی بولی اتفاق سے ملک کی سرکاری یا حکمرانوں کی زبان ہو تو اس کی دوسری تمام بولیاں آہستہ آہستہ سرکاری بولی سے متاثر ہو جائیں گی۔ اسی طرح اضلاع اور دیہات کی زبان شہروں کی زبان پر کم اثر ڈالتی ہے۔ ہمیشہ یہی دیکھا گیا ہے کہ ملک کے چھوٹے سے چھوٹا قریہ پایۂ تخت کی بولی کی تقلید کرنا چاہے گا۔

ہندوستانی بولی کی دکنی شاخ اگرچہ صدیوں تک علمی وادبی زبان رہ چکی ہے اور صرفی ونحوی خصوصیتوں کے لحاظ سے دوآبہ کی اردو سے زیادہ صحیح اور آسان ہے۔ مگر ڈیڑھ سو سال سے سیاسی حالات نے دوآبہ کی اُردو کے لئے علمی وادبی معیاری زبان بننے میں مدد کی اور اس کے استحکام کے اسباب پیدا کئے، اس لئے دکنی اُردو آج خود دکن میں راندۂ درگاہ بنی ہوئی ہے اور فطرت کی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اُدھر دوآبہ کی اردو بھی اپنے وطن میں بے پشت وپناہ ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ حیدرآباد جیسے جیسے اپنی اصلی بولی ترک کرتا جاتا ہے۔ معیاری اُردو کا سرچشمہ بنتا جارہا ہے۔

مگر جب دو زبانیں معاشرتی حیثیت سے ہم پلّہ ہوتی ہیں۔ یا اگر دو جُدا جُدا علاقوں میں

بولی جاتی ہیں تو ان میں اس قسم کے اثرات عمل پیرا نہیں ہوتے۔ سندھی اور گجراتی یا مرہٹی اور تلنگی دو مختلف زبانیں ہیں اور دو ہمسایہ علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔ مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں ایک زبان نے دوسری زبان کی آوازوں پر کوئی اثر کیا ہے البتہ معدودے چند مثالیں ایسے الفاظ کی مل سکیں گی جو سندھی سے گجراتی میں یا مرہٹی سے تلنگی میں یا اس کے برخلاف گجراتی سے سندھی میں یا تلنگی سے مرہٹی میں داخل ہوئے ہیں۔ ہم پلہ یا ہمسایہ زبانیں لفظی خزانہ کی حد تک بھی ایک، دوسرے پر بہت کم عمل یا ردِ عمل کرتی ہیں۔

معاشی اثرات لسانی تاثر و تغیر اس لئے بھی معاشرتی اور اقتصادی حالات کے تحت سمجھا جاتا ہے۔ کہ اکثر چیزوں کے وہی نام پر دیس میں بھی مشہور ہو جاتے ہیں۔ جو ان کی جائے پیدائش یا جائے ساخت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ جو زرعی یا حرفتی ملک اپنا مال پر دیس میں زیادہ فروخت کرے گا۔ اپنے مال کے ساتھ اپنے الفاظ بھی زیادہ تعداد میں روانہ کرے گا۔ چیزیں جب اپنے وطن سے باہر نکلتی ہیں تو تنہا نہیں آتیں۔ اپنا نام بھی سایہ کی طرح اپنے ساتھ لے آتی ہیں۔ اور اکثر دفعہ اپنے خریداروں کو اپنے وطن کا نام استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔

لفظ تمباکو امریکہ سے برآمد ہو کر یورپ اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں اس چیز کے ساتھ ساتھ روشناس ہوتا گیا۔ جس کو ہم تمباکو کہتے ہیں۔ میز، لالٹین، بوٹ، پتلون، ریل، موٹر، سیکل وغیرہ الفاظ انہی مقامات سے ہندوستان میں آئے ہیں جہاں سے یہ نام رکھنے والی چیزیں یہاں داخل ہوئیں۔

اس قسم کے ناموں کی زندگی عجیب پریشانی میں گذرتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں عربی

لفظ مُخیّر (ایک قسم کا کپڑا) فرانس میں "موکیارڈ" کی شکل میں داخل ہوا۔ مشہور فرانسیسی مصنف مالہرب کے یہاں تو یہ لفظ "موکیر" کی شکل میں بھی موجود ہے۔ اسی زمانہ میں یہ عربی لفظ اسپین کے راستہ سے انگلستان پہنچا۔ جہاں وہ "مکیر" ہو گیا۔ پھر مُہیر کہلایا۔ سولھویں صدی مسیحی میں فرانس میں یہ لفظ "موئر" کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر سے فرانسیسیوں نے نہ معلوم کیسے اس کو "مُہیر" کہنا شروع کیا اور اس کے برخلاف انگریزوں میں فرانسیسی شکل "موئر" رائج ہو گئی۔

ثقافتی اثرات

اگر کوئی زبان کسی اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن رکھنے والی قوم کی زبان ہے تو وہ اپنے ساتھ اس قوم کے جدید تخیلات اور اصول و مسائل بھی پردیس میں لے جائے گی۔ یونانی زبان نے عرب، ایران اور ہندوستان کے ساتھ یہی کیا۔ پھر لاطینی نے یورپ کی اکثر زبانوں کو، اور عربی نے مصر و افریقہ اسپین، ایران اور شام وغیرہ کی زبانوں کو اسی طرح مالامال کر دیا۔

لاطینی لفظ "کیسر" عربی اور پھر عربی سے ایرانی اور ہندوستانی میں "قیصر" کی شکل میں آیا تو جرمن میں "کائزر" پولستانی میں "کزار" (CZAR) زار، روس میں تزار (TZAR) زار اور انگریزی میں "سیزر" کی شکل میں رائج ہوا۔

صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں لاتعداد عربی الفاظ یورپ میں پہنچ گئے۔ اسپین اور خاص کر اندلس پر تو عرب صدیوں حکمران رہ چکے ہیں۔ چنانچہ وہاں کی زبان میں قدم قدم پر عربوں کے اثرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جہاں فارسی اور ہندوستانی بولنے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں آج بھی بعض فارسی

یا اُردو الفاظ مل جاتے ہیں۔ جو مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچ گئے تھے اور گو اب وہاں مسلمانوں کی حکومت باقی نہیں ہے۔ مگر ان کے الفاظ موجود ہیں جو ماضی کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔

یورپ میں ہر جگہ فرانسیسی الفاظ جواہر پاروں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ اور انگریزی میں تو آداب مجلس اور خورد و نوش وغیرہ کے اکثر الفاظ فرانس ہی کے ممنون منت ہیں۔

زبانوں کی اس قسم کی ممنونیت کا تناسب عوام کے سیاسی اور اقتصادی حالات کی نوعیت کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ عہد حاضر کی زبانوں میں انگریزی ایک ایسی زبان سمجھی جاتی ہے جس نے اس لین دین میں کمال حاصل کر لیا ہے جہاں اس نے زیادہ سے زیادہ الفاظ دوسروں سے قرض لئے اپنے بھی سینکڑوں لفظ بکھیر دئے۔ اگر اُردو زبان آفرینش ہی کے وقت سے فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ نمایاں نہ ہوتی تو یہ بھی اس ممنونیت میں انگریزی کے ہمسر ہوتی۔ فارسی اور عربی کا مقروض ہونا تو خیر اس زمانہ کے سیاسی حالات کے لحاظ سے اس کی سرشت میں داخل ہوگیا۔ مگر وہ اب انگریزی کی اس قدر شرمندۂ احسان ہوتی جارہی ہے کہ نہ معلوم آئندہ نسل کے لسانیاتی اس کے مقروض الفاظ کا کیا تناسب نکالیں۔

یورپ کی اکثر زبانوں میں "بحریہ" کے لئے لفظ میرین (MARINE) دراصل سامی زبان کی ایک شاخ فنیقی سے مقروض ہے۔ فن جہاز رانی میں یونانی ان کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنے استادوں ہی کا لفظ رائج کر لیا۔ پھر یونانیوں سے رومیوں نے سیکھا۔ اور رومیوں کے ذریعہ سے تمام یورپ میں اور خاصکر نارمنڈی میں پہنچ گیا

جہاں کے باشندے خاص جہازراں سمجھے جاتے تھے۔ انہی جہازرانوں نے پھر اس کو فرانس میں بھی پہنچایا۔ جو ابتک اس قیمتی لفظ کو اپنا لفظ سمجھتا ہے۔

یہی حال ایک اور سامی زبان عربی کے لفظ امیرالبحر کا ہے جو فرانسیسی میں "امیرل" کی شکل میں اور انگریزی میں "اڈمیرل" کے بھیس میں داخل ہوا۔ اور اُن کے اپنے لفظوں کے ساتھ اس قدر گھُل مل گیا کہ آج فرانسیسی اور انگریز اس کو ایک اجنبی لفظ نہیں سمجھتے بلکہ اپنے لفظوں کی طرح اس سے بھی کئی اور لفظ مشتق کر لیے ہیں۔

یورپ کی زبانوں میں آج جو مذہبی الفاظ نظر آتے ہیں۔ انھیں پہلے یونانی سے (جو مسیحی مذہب کی پہلی ترجمان تھی) لاطینی نے اخذ کیا، بعد میں وہ لاطینی سے جدید زبانوں میں پہنچ گئے۔ خوردونوش سے متعلق الفاظ (جیسے بیان کیا جا چکا ہے) فرانسیسی سے ماخوذ ہیں اور اسی طرح کھیل کود کے نام اور اصطلاحیں انگریزی زبان نے غیروں کو عنایت کیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں فرانس کے عوام خوردونوش کے سامان میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ انگریز کھیل کود کے شائق ہیں۔ چنانچہ بہت سے جدید کھیلوں کے بانی وہی سمجھے جاتے ہیں۔

عالموں کا حصہ

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر زبان کے علما اور انشا پرداز اس پردیسی قرض کو دور کرنے کی ممکنہ کوشش کرتے ہیں۔ جو عوام کی سہل اثر پذیری کی وجہ سے زبان کو گھیرے رہتا ہے۔ ہر دور قدیم عہد کے لفظی خزانہ کی تنقیح کرتا ہے۔ اور اگر اس عہد کے انشا پرداز ذوق سلیم سے کافی بہرہ ور ہوں تو اس کی زبان بھی گذشتہ کے نقائص اور بے جا احسانمندیوں سے پاک ہو جاتی ہے۔

ارادی تشکیل

فرانس میں ایک باضابطہ سرکاری اکیڈیمی قائم ہے جس کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ موقع بہ موقع اپنے لفظی خزانہ کی تنقیح کرے اور زبان و ادب میں آئے دن جو نئے نئے الفاظ یا ترکیبیں رائج ہو جاتی ہیں ان پر غور کر کے انھیں قبول یا ان کے خلاف مدلّل فیصلہ جاری کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرانسیسی زبان کی لُغت میں کوئی لفظ اس فاضل جماعت کی منظوری کے بغیر درج نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی ایسے موقع بھی آئے ہیں کہ کسی لفظ کو اس اکیڈیمی نے نامنظور کر دیا۔ حالانکہ عوام اور ان کے نمایندوں یعنی اخباروں اور رسالوں نے اس کے قبول کرنے کے لئے بہت زور دیا[۱]۔

جرمن زبان میں جنگ عظیم سے پہلے فرانسیسی الفاظ کی ایک کافی تعداد موجود تھی۔ مگر شکست کے بعد سے جرمنوں کو فرانس سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ انھوں نے جملہ فرانسیسی الفاظ خارج کر دیے اور ان کی جگہ جرمن لفظ رائج کر لئے۔ جن کے جلد سے جلد وضع ہونے اور رائج کرنے میں جرمنی کے ارباب علم و فضل نے عوام کا بہت ہاتھ بٹایا۔

ارباب علم و فضل کی اس قسم کی خدمات سے خود ہماری زبان محروم نہیں ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ہماری شاعری میں صنعت ایہام کا بہت زیادہ استعمال کیا

---

[۱] ابھی دو تین سال قبل جب راقم پیرس میں زیر تعلیم تھا اس قسم کا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فرانسیسی اکیڈیمی نے ایک خاص غیر ثقہ لفظ کو اپنی زبان میں قبول کرنے سے انکار کیا جس پر طالب علموں اور عوام نے بڑا ہنگامہ مچایا۔ متعدد جلسے کئے۔ مضامین لکھے ہڑتالیں منائیں مگر اکیڈیمی نے کوئی توجہ نہ کی۔ آخر مخالفانہ مظاہرے کئے گئے اور طلبہ نے اکیڈیمی کے مکان پر حملہ کیا۔ حکومت نے انھیں منتشر کر دیا۔ مگر کئی دن تک پیرس اور خاص کر اس کے "لاتینی خطہ" میں جہاں جامعہ اور مدارس واقع ہیں۔ عجیب چہل پہل رہی۔ عوام اور طالب علم اسی ممنوعہ لفظ کو پکار کر ملفوظ کرتے اور اراکین اکیڈیمی یا عالموں کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

جاتا تھا اور بھاشا الفاظ کی کثرت تھی۔ چنانچہ عہد محمد شاہ کے تمام شاعروں کا کلام اسی رنگ میں ہے۔ مگر اُسی دَور میں مرزا مظہر پیدا ہوتے ہیں اور اس کے خلاف خیالات کی اشاعت کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض بڑے ہمعصروں کی مخالفت کے باوجود قدیم رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ عوام کا مذاق بدل جاتا ہے اور نئی پود بالکل نئے لفظی خزانوں کے ساتھ محفلوں میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی زبان میں کدھیں کی جگہ کبھی، کسو کی جگہ کسی، ٹک کی جگہ ذرا اور اس طرح کے سینکڑوں تبدیل شدہ الفاظ سُنائی دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی نہایت قلیل عرصہ میں اس قدر اہم بن گئی تھی کہ سن رسیدہ شاعروں کو اپنے قدیم کلام کی زبان پر نظر ثانی کرنا پڑی اور اپنی شاعری کا نیا انتخاب مرتب کرنا پڑا۔

اُردو زبان کے لفظی خزانہ کی کانٹ چھانٹ اور اس کے معین کرنے میں مظہر کے بعد ناسخ نے بھی بہت حصّہ لیا۔ جس کا ذکر ہندوستانی کے ارتقا کے سلسلہ میں کیا جائے گا۔ یہاں جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کا ذکر ضروری ہے۔ جہاں ہر روز متعدد ارباب علم و فضل اور ماہرین زبان نئے نئے علوم و فنون کی اصطلاحیں وضع کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اور اردو زبان کی ارادی تشکیل میں خاص طور پر منہمک ہیں۔

وضع اصطلاحات زبانوں کی ارادی تشکیل میں عالموں کی اصطلاح سازی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ نئے علوم اپنے ساتھ نئے نام بھی لے آتے ہیں۔ مگر زندہ قومیں اس لفظی درآمد کو قبول نہیں کرتیں۔ بلکہ اپنے لفظ وضع کرتی ہیں۔ اور اس کام میں اُنھیں اپنے اربابِ علم و فضل کا مرہونِ منّت ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان عالموں کا سلیقہ اور ذوق جتنا اعلیٰ ہوگا۔ اسی کے

مناسب الفاظ کی تخلیق ہو گی۔

عہدِ حاضر میں اس قسم کی ارادی تشکیل کے جیسے اعلیٰ اور کثیر نمونے اردو زبان میں دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں ان کی نظیر موجود ہو۔

دُنیا کی زبانیں

طریقۂ تقسیم، مختلف خاندان، ہندیورپی، ہند ایرانی

طریقۂ تقسیم دُنیا میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کی گروہ بندی دو طرح سے عمل میں آتی ہے پہلی قسم میں زبانوں کی لفظی اور صرفی خصوصیات کے لحاظ سے صرف دو بڑی جماعتوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کی گروہ بندی نسلی اور تاریخی تعلقات کی بنا پر عمل میں آتی ہے۔ اور اس میں متعدد جماعتیں ہیں۔

پہلی تقسیم میں جو دو جدا جماعتیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں پہلی جماعت ان زبانوں کی ہے جو یک لفظی ہوتی ہیں۔ اور جن کے اساسی الفاظ شکلی تبدیلیوں کے ذریعہ سے اپنے مفہوم میں تغیر و تبدّل اور اضافہ نہیں کرتے۔ اس قسم کی زبانیں سرزمین چین، ہندوستان کے مشرقی ممالک اور انہی اطراف و اکناف کی آبادیوں میں رائج ہیں۔ ان زبانوں میں تمام الفاظ بالعموم آزاد ہوتے ہیں۔ اور اُن میں سابقوں اور لاحقوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔

اس تقسیم کی دوسری جماعت میں دنیا کی جملہ باقی ماندہ زبانیں شامل ہیں۔ ان میں الفاظ اپنی شکلیں اور ان کے ساتھ مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی سابقوں اور لاحقوں کے ذریعہ سے بھی ان کے معانی میں قسم قسم کے پہلو پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ہی لفظ اصل یا مصدر ہوتا ہے اور اسی سے سینکڑوں لفظ مشتق ہوتے ہیں۔

دُنیا کی زبانیں

تاریخی اور نسلی تعلقات کے لحاظ سے دُنیا کی زبانوں کو آٹھ بڑے بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں کا ہر خاندان واضح کرتا ہے کہ اس کے بولنے والے خاص خاص ممالک یا قبیلوں کے افراد ہیں۔ جن میں سے بعض اس وقت ایک دوسرے سے جُدا بھی ہو گئے ہیں لیکن ان کی زبان میں وہی قدیم اشتراک باقی ہے۔

مختلف خاندانِ السنہ

دُنیا کے آٹھ بڑے بڑے خاندانِ السنہ یہ ہیں:۔
۱۔ سامی، ۲۔ ہند چینی، ۳۔ ڈراوڈی، ۴۔ منڈا ۵۔ افریقہ کی بانتو، ۶۔ امریکی، ۷۔ ملایا، ۸۔ ہند یوروپی۔

سامی زبانیں سام ابن نوح علیہ السلام سے منسوب ہیں جن کا ذکر انجیل مقدس اور قرآن شریف میں پایا جاتا ہے۔ اور جن کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ان تمام قوموں کے جداعلیٰ ہیں جو اس وقت سامی زبانیں بولتی ہیں۔

سامی کی مشہور شاخوں میں آشوری (جس میں شام اور بابل کی مفقود زبانیں شامل ہیں)، عبرانی، فنیقی، عربی اور چند حبشی بولیوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ عبرانی اور عربی نے یہودیوں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی وجہ سے اس جتھے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔

ہند چینی گروہ میں خاص چینی زبان کے علاوہ حسب ذیل زبانیں بھی شامل ہیں:۔
۱۔ سیامی، جس کی سات شاخیں ہیں۔ ۲۔ تبتی یا ہمالوی جس کی (۲۳) شاخیں ہیں۔ اور ۳۔ برمی جس کی (۲۶) شاخیں ہیں۔

اس گروہ کی زبانوں میں چینی خاص کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اسی میں قابل وقعت ادب موجود ہے۔ برمی زبانیں جو بحر ہندستانی رقبہ میں شامل ہیں۔ اس لئے انکا

ذکر آیندہ باب میں کیا جائے گا۔

ڈراوڑی گروہ کی چار یا پانچ زبانیں قابل ذکر ہیں۔ ۱۔ تامل، ۲۔ تلگو، ۳۔ ملیالم، ۴۔ کنڑی، اور ۵۔ براہوئی، چونکہ یہ سب زبانیں ہندوستان میں بولی جاتی ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر آئندہ باب میں کیا جائے گا۔

مونڈا زبانوں کا تعلق بھی ہندوستان ہی سے ہے۔ ان کی خاص شاخیں یہ ہیں۔ ۱۔ گونڈ، ۲۔ سنتھال، ۳۔ منڈلی، ۴۔ راج محلی، ۵۔ سمبھل پوری۔

افریقہ کے اصلی باشندے جو زبانیں بولتے ہیں انھیں بانتو گروہ میں شامل کیا جاتا ہے اور ان کی ایک سو پچاس جدا جدا شاخیں ہیں۔ اسی طرح امریکہ کے اصلی باشندوں (ریڈ انڈین) کی اور ملایا کی زبانیں بھی علٰحدہ علٰحدہ سمجھی جاتی ہیں۔

دنیا کی زبانوں کا آخری مگر سب سے اہم جتھا ہند یورپی ہے جس سے ہماری ہندستانی زبان کا تعلق ہے اس لئے ہم اس پر نئی سرخی کے تحت ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

ہند یورپی یہ خاندان السنہ سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس میں اکثر ایسی زبانیں داخل ہیں جو اپنے ادبی اور علمی ذخیروں کے لحاظ سے دنیا کی سب سے اعلیٰ زبانیں کہلائی جا سکتی ہیں۔ ان زبانوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اجزا ایک دوسرے سے اس قدر گھل مل جاتے ہیں اور ان میں اس قدر تغیر و تبدل پیدا ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ایک ہی لفظ مختلف شکلوں اور متعدد معنوں میں مستعمل نظر آتا ہے۔

دوسرے لسانی خاندانوں کے مقابلہ میں یہ جتھا نہایت وسیع اور زیادہ اہم حصّۂ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں زیادہ تر اسی خاندان کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اٹالوی وغیرہ بھی اسی میں

شامل ہیں۔ ایران، توران، ارمینیا وغیرہ کے باشندے بھی اسی کی شاخیں بولتے ہیں۔ ان تمام دور دراز ملک کی زبانیں نہ صرف نوعیت بلکہ نسل اور خاندان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں کہ ان کو ایک ہی ماں کی متعدد بیٹیاں کہا جاسکتا ہے۔

ابتدائی زبان کو اس کی متفرق شاخوں کے ساتھ تین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہند یورپی ہند جرمانی آریائی پہلا نام ان ملکوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں زیادہ تر یہی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح نام ہے۔ دوسرا نام عام طور پر جرمنی میں مستعمل ہے اور پورے خاندان کے لئے غیر تشفی بخش ہے۔ آخری نام صحیح نہیں۔ کیونکہ وہ اس خاندان کی صرف ایشیائی شاخ پر صادق آسکتا ہے۔ لیکن یہ نام انگریزی دانوں میں اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ شاید یہی زندہ رہ جائے۔

ہند یورپی خاندان کی زندہ زبانوں کو آٹھ شاخوں پر منقسم کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہند ایرانی یا آریائی۔ ۲۔ ارمنی، ۳۔ بلقان سلانی۔ ۴۔ البانوی، ۵۔ ہیلینی ۶۔ اٹالوی، ۷۔ کیلٹک، ۸۔ ٹیوٹونی۔

ہند ایرانی یا آریائی خاندان ہی سے ہماری زبان اردو کا تعلق ہے اس لئے اس پر ہم آئندہ تفصیل سے بحث کریں گے۔ ہند یورپی جتھے کی دوسری زبانوں میں ہیلینی، اٹالوی اور ٹیوٹونی بہت اہم شاخیں ہیں۔ ہیلینی میں قدیم و جدید یونانی زبانیں شامل ہیں جو اپنے ذخیرہ ادب کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ اٹالوی شاخ میں لاطینی، موجودہ اٹالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں شامل ہیں۔ لاطینی زبان میں قدیم یونانی کی طرح انسان کے قدیم تخیل، طرز معاشرت کے ارتقا اور دنیاوی قوانین کے انتہائی عروج کے مطالعہ کے لئے کافی ذخیرۂ ادب موجود ہے۔ فرانسیسی اور موجودہ اٹالوی دونوں زبانیں دنیا کی جدید ترقی یافتہ السنہ میں اپنے

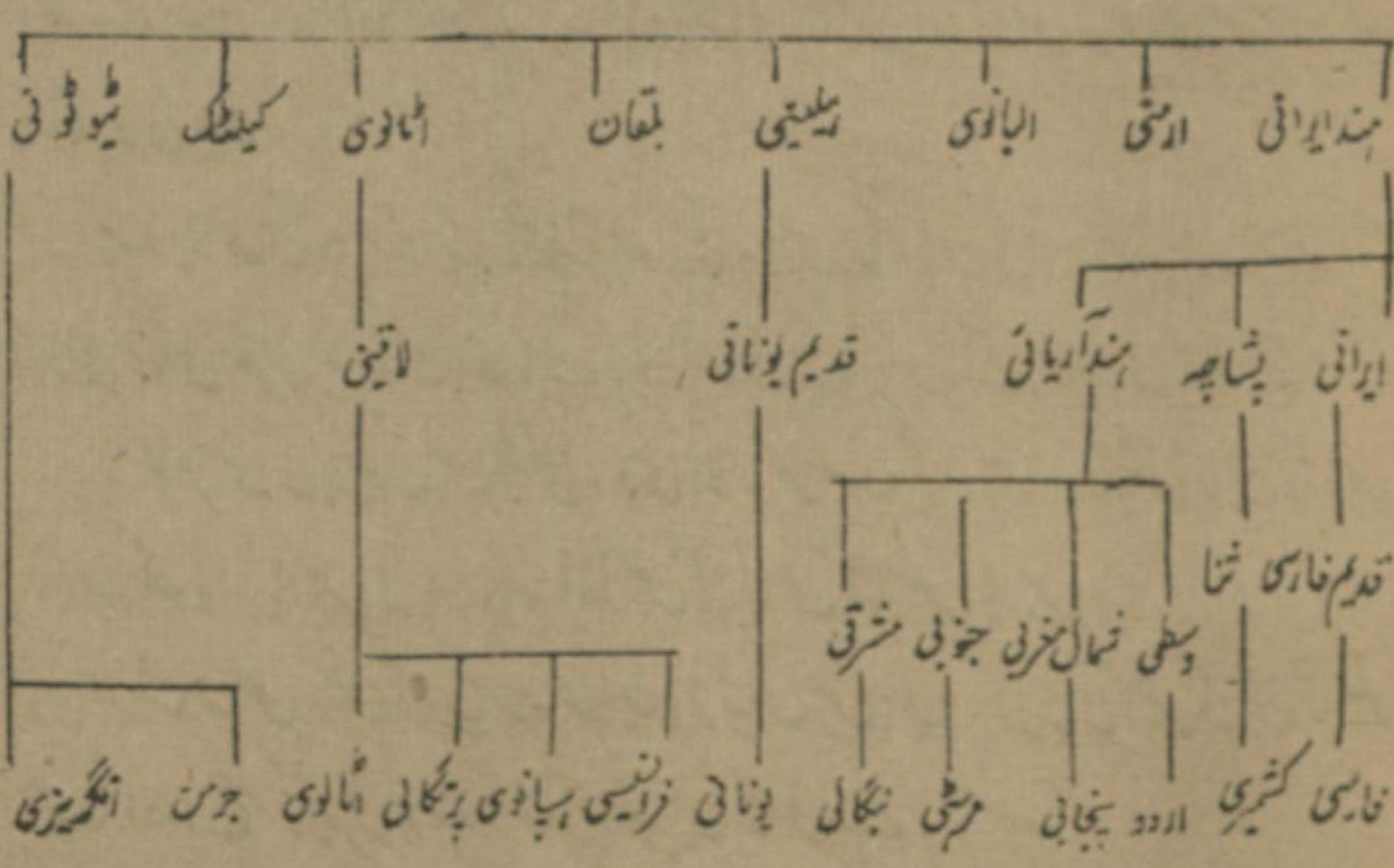
اعلیٰ علم و ادب اور تہذیب و تربیت کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔

ٹیوٹانی شاخ میں جرمن اور انگریزی زبانیں شامل ہیں جو نہ صرف اس لئے اہم ہیں کہ اس کے بولنے والے دنیا کے بہت بڑے ترقی یافتہ حصہ میں آباد ہیں اور کئی قوموں پر سیاسی اثر رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کا علم و ادب بھی دنیا کی اکثر زبانوں کے علم و ادب سے اعلیٰ ہے۔

ہندیورپی جتھے کی دوسری زبانیں کیلٹک، ارمنی، البانوی اور بلقان سلانی ہیں مگر نہ اُن کے بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور نہ ان کا ادب کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ہندیورپی خاندان السنہ کا یہاں ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کی بعض اہم موجودہ زبانوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے۔

ہندیورپی



ہند ایرانی زبانیں اس خاندان کی تین شاخیں ہیں۔ ۱۔ ایرانی، ۲۔ پشاچہ، ہند آریائی۔ ایرانی خاندان کی زبانیں متعدد ہیں۔ اوستا (تقریباً ۶۰۰ قبل مسیح) اور ہنجامنشی کتبوں کی قدیم ایرانی (۵۲۰ سے ۳۵۰ قبل مسیح) اس خاندان کی سب سے مشہور زبانیں ہیں جو بحر اسود سے لے کر وسط ایشیا تک بولی جاتی تھیں۔ اس کے بعد جو ایرانی زبانیں نکلیں اور پھیلیں انھیں ہم تین اہم شاخوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ مشرقی، ۲۔ جنوب مغربی، ۳۔ مغربی۔

مشرقی ایرانی کو ختنی بھی کہتے ہیں۔ اس کی بولیوں میں ۱۔ غلچہ (پامیر کی زبان) ۲۔ وخی بولیاں، ۳۔ سریخولی اور ۴۔ مینجانی قابل ذکر ہیں۔ جنوب مشرقی تقسیم میں پشتو اور بلوچی زبانیں شامل ہیں جو ہندوستان کی شمالی مغربی سرحدوں پر بولی جاتی ہیں۔ مغربی شاخ کو فارسی بھی کہتے ہیں۔ اس میں شمال اور وسط کی بولیاں، قدیم فارسی پہلوی اور جدید فارسی اور کردی زبانیں شامل ہیں۔ جدید فارسی اپنے علم و ادب کی وجہ سے بہت مشہور اور مقبول ہے۔ ہندوستانی زبانیں اور خاص کر اردو اس سے بیحد متاثر ہوئی ہے۔

ہند ایرانی کی دوسری شاخ پشاچہ ہے۔ اس خاندان کی زبانیں ہندوستان کے انتہائی شمالی مغربی سرحدی مقامات پر بولی جاتی ہیں۔ ان کے تین ذیلی جتھے ہیں۔

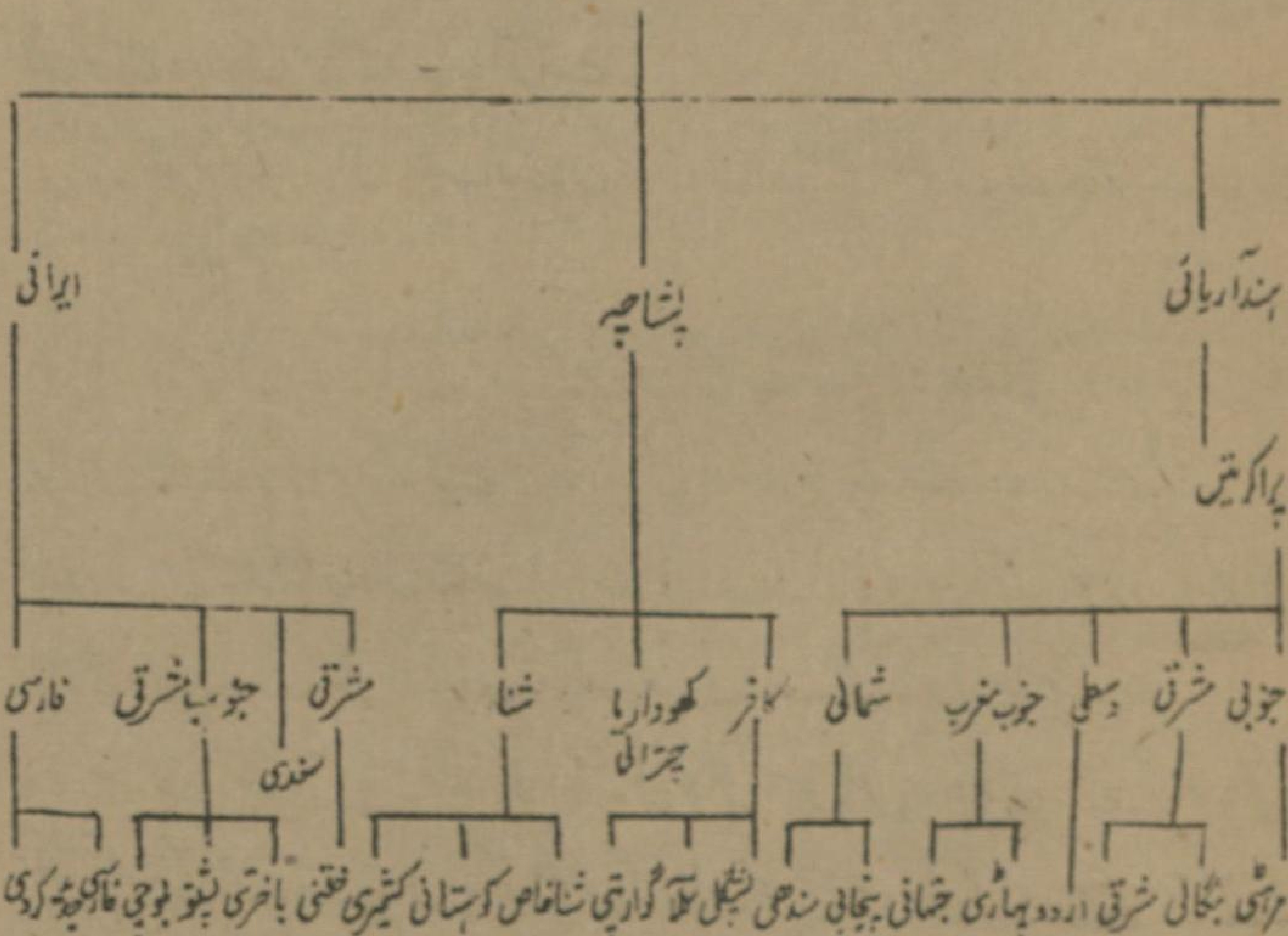
۱۔ کافر جس کی بولیوں میں بشگلی، دی الا، کلاسہ، گوارپتی اور پشئی قابل ذکر ہیں۔

۲۔ کھووار یا چترالی اور ۳۔ شنا جس کی خاص شاخیں یہ ہیں:۔

ا۔ شنا خاص (جس کی سات جدا جدا بولیاں ہیں) ب۔ کوہستانی (جس کی تین شاخیں ہیں) اور ج۔ کشمیری جو ہندوستانی رقبہ میں شامل ہے۔

ہند ایرانی کی تیسری شاخ ہند آریائی ہے۔ چونکہ اس خاندان سے ہماری زبان اُردو کا راست تعلق ہے۔ اس لئے ہم اس کی تفصیل ایک علٰحدہ باب میں بیان کریں گے یہاں ہم ہند آریائی خاندان کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس کے مطالعہ سے اس خاندان کی مختلف زبانوں کے تعلقات واضح ہوسکیں گے۔

ہند ایرانی زبانیں



ہند آریائی ارتقا

ہند آریائی ادوار، آریاؤں کا ورود، گریرسن کا نظریہ

ہندوستان کی ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کو لسانی اور صوتی مدارج ارتقا کے لحاظ سے تین وسیع دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ قدیم ہند آریائی۔ جب کہ زبان آوازوں اور لفظی شکلوں کے لحاظ سے نہایت وسیع تھی۔

۲۔ درمیانی ہند آریائی۔ جب کہ حروف صحیح کے قدیم گروہوں میں آسانیاں پیدا ہو رہی تھیں اور گرامر کے صیغے کم اور آسان ہوتے جاتے تھے۔ یہ دَور پھر تین ذیلی عہدوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ا۔ ابتدائی، ب۔ ثانوی، ج۔ آخری۔ ابتدائی اور ثانوی عہدوں کے درمیان "ایک عبوری دَور" بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جدید ہند آریائی۔ جب کہ دَور ثانی کا عمل تسہیل مکمل ہو چکا تھا۔ اور گرامر وغیرہ میں اس حد تک تبدیلیاں ہو گئی تھیں کہ زبان کا نہج ہی بدل گیا اور ہندوستان کی موجودہ بولیاں وجود میں آئیں۔

پہلے دَور کی خاص نمائندہ زبانیں ویدی اور سنسکرت ہیں۔ دوسرے دَور کی زبانیں یہ ہیں۔ ا۔ وہ پراکرتیں جو اشوک وغیرہ کے کتبوں میں محفوظ ہیں۔ ب۔ پالی۔ ج۔ وہ پراکرتیں جن میں ادب موجود ہے۔

ہند آریائی ارتقا

دوسرے اور تیسرے دَور کے سنگم پر ہمیں ادبی اپبھرنشا زبانیں ملتی ہیں۔ اور یہ ادبی اپبھرنشائیں ان عام بول چال کی اپبھرنشاؤں پر مبنی ہیں جن کے اختتام کے ساتھ قدیم پراکریتں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ جدید ہند آریائی بھاشائیں پیدا ہوتی ہیں

ان تین ہند آریائی دَوروں کے نام۔ ۱۔ ویدی یا سنسکرت۔ ۲۔ پراکرت، اور ۳۔ بھاشا کے دَور بھی قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اور پراکرت اور بھاشا کا درمیانی عہد جو دراصل پراکرت دَور ہی میں شامل ہے۔ اپبھرنشا کہلاتا ہے۔

تاریخ السنہ یں کبھی ٹھیک ٹھیک سنیں نہیں بتائے جا سکتے۔ مگر ویدی بھجنوں کے زمانۂ تصنیف (جو ممکن ہے ۱۵۰۰ سے ۱۲۰۰ ق م ہو) سے گوتم بدھ (۵۷۷، ۴۷۷ ق م) کے عہد تک کے درمیانی دَور کو "قدیم ہند آریائی دَور" کہہ سکتے ہیں۔ "درمیانی ہند آریائی دَور" ۷۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں ۶۰۰ ق م سے ۲۰۰ ق م تک "درمیانی ہند آریائی دَور" کا پہلا یا ابتدائی عہد کہلاتا ہے۔ ۲۰۰ ق م سے ۲۰۰ عیسوی تک تیسرا دور کہلاتا ہے۔ ۱۰۰۰ء کے بعد کی دو تین صدیاں "جدید ہند آریائی دَور" کا آغازی حصہ ہیں۔ جس میں ہندوستان کی جدید آریائی بولیاں وجود پاتی ہیں۔

ہند آریائی ارتقا کے تینوں[۱] دَور اس قدر وسیع اور اہم ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر جدا جدا کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ پہلے دور کی نسبت تو یورپ اور امریکہ میں بڑی کامیابی کے ساتھ تفصیلی بحثیں کی گئی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دور السنۂ وید و سنسکرت سے متعلق ہے۔ یہ وہ زبانیں ہیں جن کے اجزا اور اصول ترکیب ہند یورپی خاندان السنہ

---

[۱] ان دَوروں کی صوتی، لغوی اور لسانی خصوصیتیں اور اختلاف پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کی مطبوعہ کتاب "آغاز و ارتقائے بنگالی" میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

کی دوسری شاخوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل فہم اور محفوظ ہیں۔ ان پر ازمنہ قدیم و متوسط کے ہندوستانی قواعد وال بہت کچھ مواد اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف سنسکرت ہی پر غور و فکر کرنے کا نتیجہ تھا کہ ماہرین لسانیات کو اس امر کا انکشاف ہوا کہ زبانوں کے علٰحدہ علٰحدہ خاندان بھی ہیں۔ ہند یورپی خاندان کی تمام اہم زبانوں کے متعلق جس قدر معلومات سنسکرت کی تحقیقات سے حاصل ہوتی ہیں۔ کسی اور زبان سے نہیں ہوتیں۔ اس زبان کے بیش قیمت ڈرامے اور فلسفیانہ تصانیف انسانی تخیل کی تاریخ پر غور کرنے کے لئے ہمیشہ خضرراہ کا کام دیتی رہیں گی۔ لیکن لسانیات کیلئے اس دور کی سب سے بیش قدر یادگار مذہبی ارشادات کے وہ مجموعے ہیں جو وید کہلاتے ہیں۔

آریاؤں کی آمد ہند یہ آریائی زبان ہندوستان میں ایک تنہا اور معین معیاری زبان کی شکل میں نہیں داخل ہوئی بلکہ ان متعدد بولیوں کے ایک گروہ کی حیثیت سے جو متفرق آریا قبیلوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں اِن میں سے صرف ایک ابتدائی بولی ویدوں کی زبان ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی مگر اس عہد میں یقیناً دوسری بولیاں بھی رائج تھیں جو تغیر و تبدّل حاصل کرکے آج جدید ہند آریائی زبانوں کی شکل میں موجود ہیں ان قدیم ہند آریائی بولیوں میں جو باہمی اختلاف و اتحاد تھا اس کی نسبت اس وقت زیادہ مواد موجود نہیں ہے۔ مگر یہ گمان غالب ہے کہ تین ہزار سال پہلے بھی ہند آریائی زبانوں کے آپس میں کچھ اختلافات ضرور پائے جاتے تھے۔

آریا بولنے والے ہندوستان میں ۱۵۰۰ ق م سے پہلے ہی وارد ہوئے ہیں۔

کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ وید کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ ہندوستان آنے سے پہلے آریا قبیلے کچھ عرصہ کے لئے افغانستان میں ٹھہر کر تازہ دم ہوتے رہے اور پھر دریائے کابل اور قرم کے کنارے کنارے پنجاب میں داخل ہوئے۔

ابتدائی آریا جو وید، اوستا، یونانی اور لاتینی وغیرہ بولتے تھے دراصل خانہ بدوش تھے البتہ زراعت کے متعلق کچھ معلومات رکھتے تھے۔ مگر ان کی نسل اور وطن کے متعلق ابھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کے وطن کے بارے میں اگرچہ متعدد مقامات کی طرف مختلف مستشرقین نے اشارے کئے ہیں مگر سب سے زیادہ قابل وثوق جگہ روس کے جنوب اور مغربی علاقہ سے وسط ایشیا کے الثائی اور تیان شن پہاڑوں تک کا درمیانی علاقہ ہے جو ان آریاؤں کا وطن کہلایا جا سکتا ہے۔

جیسا بیان کیا جا چکا ہے۔ آریا ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے شرقی ایران اور افغانستان میں چند دن ٹھہر چکے تھے اور وہاں ان کی زبان ایک حد تک ارتقا پا چکی تھی اسی کو ہم ہند ایرانی یا آریائی زبان کہتے ہیں۔

آریاؤں نے ہندوستان کی طرف جو سفر کیا اس کا سبب غالباً یہی تھا کہ وہ اس وقت نیم خانہ بدوش قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور نئی جگہ اور نئے وطن کی تلاش میں نکلے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مشرقی ایران ان کی کثرت آبادی اور کثرتِ رسوم والسنہ کا متحمل نہ ہو سکا ہو جو قبیلے اپنے خاص خاص رسم و رواج کے ساتھ ہندوستان میں آئے۔ انھیں کے سر ہند کی تہذیب و تمدن کے آغاز کا سہرا باندھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یقیناً ان قوموں کا اثر بھی قبول کیا ہوگا جو اس ملک میں پہلے سے آباد تھیں۔ جو آریا ایران میں رہ گئے ان میں سے

بعض سامی، بابلی اور آشوری عناصر سے متاثر ہو کر اپنا ایک عالیشان تمدن بنا سکے جو آج قدیم ایرانی تمدن کہلاتا ہے اور ان کے جو قبیلے ان اثروں میں نہ آسکے اور اپنا کوئی جدا تمدن نہ بنا سکے وہ آج بلوچی اور افغانی کہلاتے ہیں۔ ان کے ایک تیسرے گروہ نے ہندوکش کے مشرق جنوب کی غیر مہماں نواز پہاڑیوں میں اقامت اختیار کی۔ انکی بولیاں آج وردیا پشاچہ زبان کی شاخیں کہلاتی ہیں جن کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے۔ انہی پشاچہ قبیلوں نے کشمیر بھی آباد کیا۔

گریرسن کا نظریہ سر جارج گریرسن کی تحقیقات کے بعد سے یہ خیال عام طور پر پھیل گیا ہو کہ ہندوستان میں آریاؤں کے دو گروہ آئے۔ ایک پہلے آیا ایک بعد۔ پہلا گروہ دوآبہ گنگ وجمن میں قیام پذیر تھا کہ دوسرا گروہ وارد ہوا اور پہلے گروہ کو شمال، جنوب اور جنوب مغرب کی طرف کو ڈھکیل دیا۔ اس طرح سے وہ "اندرونی آریا" بن گئے اور ہزیمت خوردہ گروہ "بیرونی آریا" کہلایا۔ ویدوں اور برہمنوں کی تہذیب و معاشرت نے اندرونی دائرے کے آریاؤں میں پرورش پائی۔ اور ان کی زبان بیرونی دائرہ کے آریاؤں کی زبان سے الگ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زبانوں کے دو گروہ قرار پائے۔ ۱۔ اندرونی دائرہ کی زبانیں۔ ۲۔ بیرونی دائرہ کی زبانیں۔

بیرونی دائرہ میں پنجابی، سندھی، گجراتی، راجپوتی، مرہٹی، مشرقی ہندی کی قسمیں اور اُن کے علاوہ بہاری، بنگالی، اڑیہ اور آسامی شامل ہیں۔ اندرونی دائرہ میں مغربی ہندی اور اس کی شاخیں بانگرو، قنوجی اور برج بھاکا وغیرہ۔

گریرسن اور ان کے متبعین کا یہ نظریہ زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے جس مواد سے کام لیا ہے۔ وہ نسبتاً بعد کا ہے۔ اور ثابت نہیں کرسکتا کہ اندرونی اور بیرونی

دائرہ کی زبانیں دو جدا جدا نسلیں اور گروہوں کی پیداوار ہیں۔ ان میں کوئی ایسی خاص خاص خصوصیتیں تو نہیں ہیں جن کی بنا پر یہ رائے تسلیم کی جا سکتی ہو۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب "آغاز و ارتقائے بنگالی" کے ضمیمہ میں اس موضوع پر کافی بحث کی ہے اور چونکہ ہمارے موجودہ موضوع سے اس کا کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتے۔ ہماری نظر میں بھی دیبر اور چٹرجی کا یہ خیال درست ہے کہ موجودہ ہند آریائی زبانوں کو ان کی لسانی اور ترکیبی خصوصیتوں کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ شاخوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔

۱۔ شمال مغربی۔ ۲۔ جنوب مغربی۔ ۳۔ وسطی۔ ۴۔ مشرقی۔ ۵۔ جنوبی۔

ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانیں

موجودہ ہند آریائی زبانوں کو ان کی لسانی اور ترکیبی خصوصیتوں کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ شاخوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

۱۔ شمال مغربی۔ ۲۔ جنوب مغربی، ۳۔ وسطی، ۴۔ مشرقی۔ ۵۔ جنوبی۔

شمال مغربی شمال مغربی گروہ کی زبانوں میں مغربی اور مشرقی پنجابی اور سندھی کے علاوہ ان جپسیوں کی بولیاں بھی شامل ہیں جو ارمینیا، ایشیائے کوچک، شام اور یورپ کے مختلف مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

ا۔ مغربی پنجابی یا لہندا زبان کئی اور ناموں سے بھی موسوم ہے۔ مثلاً ہندکو، جٹکی ملتانی، پھوٹھواری وغیرہ۔ یہ کئی بولیوں کا مجموعہ ہے۔ جو مغربی حصۂ پنجاب کے تقریباً پانچ ملین باشندوں میں مستعمل ہیں۔ اس کے بولنے والے ادبی اور علمی مقاصد کے لئے بالعموم اردو زبان اور خال خال ہندی اور مشرقی پنجابی استعمال کرتے ہیں۔

مغربی پنجابی میں بہت کم ادب موجود ہے صرف سکھوں کی "جنم ساکھی" اور چند مقبول نظمیں اور گیت ہیں جن کی زبان بھی مشرقی پنجاب سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ مغربی پنجابی کو کبھی "لنڈا" رسم الخط" میں لکھا کرتے تھے جو "شاردا" کی ایک قسم ہے۔ مگر اب اس کا رواج بہت کم ہوگیا ہے۔ اور جب کبھی یہ زبان لکھی جاتی ہے۔ فارسی رسم الخط ہی استعمال ہوتا ہے۔

ب۔ مشرقی پنجابی جو عام طور پر پنجابی کہلاتی ہے۔ تقریباً سولہ ملین باشندوں کی

زبان ہے۔ یہی وہ واحد مشترک پنجابی ہے جو مغربی ہندی کی مغربی سرحد سے لے کر پشتو بولنے والے علاقوں تک عام طور پر مستعمل ہے۔ اس زبان پر قدیم زمانہ ہی سے مغربی گنگائی علاقہ کی وسطی زبان کا اثر مستولی رہا ہے۔

مشرقی پنجاب کی کئی بولیاں ہیں جن میں سے ڈوگری زیادہ مشہور ہے۔ یہ بولی ریاست جموں اور ضلع کانگڑہ میں رائج ہے۔ مشرقی پنجابی نے تھوڑی سی ادبی نشوونما بھی حاصل کی ہے۔ اس کے قدیم ترین تحریری نمونے سکھوں کی چند نظمیں ہیں جو سولھویں صدی عیسوی سے وجود میں آتی رہی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سکھ قوم اس زبان میں کچھ ادب کا اضافہ بھی کر رہی ہے۔ سکھ گورمکھی رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ جو "لنڈا" کی ایک اصلاح یافتہ شکل ہے مگر ہندوستانی (اردو اور ہندی) کو مشرقی پنجابی بولنے والوں میں ہمیشہ ایک خاص مقبولیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ مشرقی پنجابی لکھنے کے لئے فارسی رسم الخط بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ج ۔ سندھی دریائے سندھ کی نشیبی وادی اور علاقہ کچھ میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے تقریباً ساڑھے تین ملین ہیں۔ اس کی پانچ شاخیں ہیں:-

۱۔ وچولی، ۲۔ سرکی، ۳۔ لاڑی، ۴۔ تھرلی۔ ۵۔ کچھی۔

سندھی جس رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ وہ فارسی وعربی سے ماخوذ ہے۔ مگر اس کا اصلی رسم الخط "لنڈا" بھی تاجروں میں مقبول ہے۔ کبھی کبھی گورمکھی خط بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سندھی میں گرامر کی شکلوں کے لحاظ سے چند قدیم خصوصیتیں ابتک موجود ہیں اور اس کی صوتیات بھی عجیب وغریب ہے۔ چار آوازیں اس زبان میں ایسی رائج ہیں جو ہندوستان کی کسی اور زبان میں خواہ وہ آریائی ہو یا ڈراویڈی یا کولی یا تبت

چینی نہیں پائی جاتیں۔ حروف گ، ج، ڈ، ب کا تلفظ وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کہتے وقت سانس نرخرہ میں رُک جاتی ہے۔ اس خصوصیت کو چھوڑ کر کئی صوتی اور لغوی اُمور میں پنجابی اور سندھی قریب قریب ہیں۔ سندھی میں تھوڑا سا ادب بھی موجود ہے جس میں چند نثری قصّے قابل ذکر ہیں۔ اس کی نظم و نثر فارسی طرز پر لکھی جاتی ہے۔

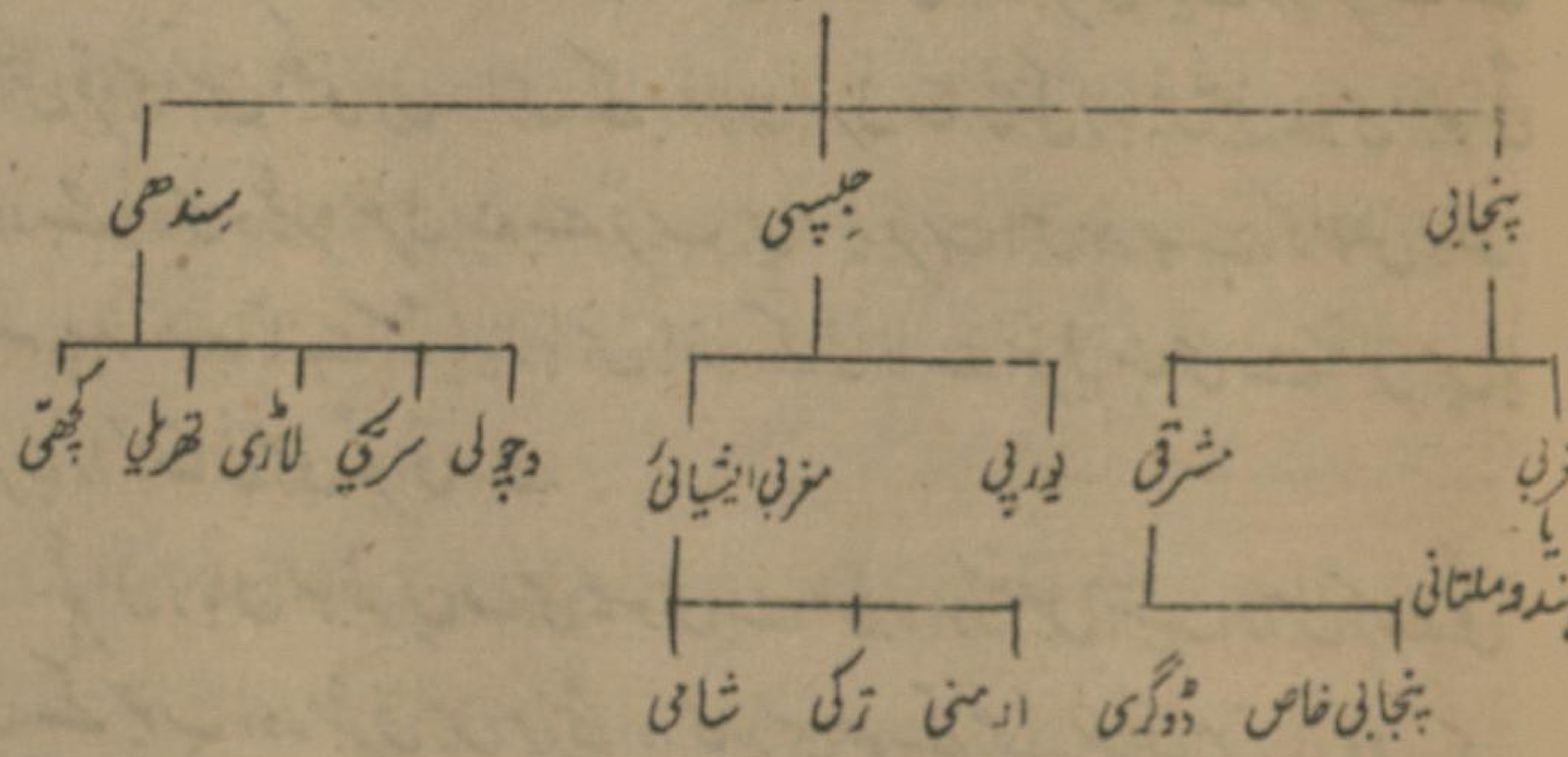
۷۔ جلپسیوں کی یورپ اور مغربی ایشیا کی بولیوں کو دو شاخوں پر منقسم کیا جاتا ہے ۱۔ ارمنی۔ ۲۔ یورپی۔ یہ بولیاں ان پراکرتی زبانوں سے مشتق ہیں جو شمال مغربی ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ ان کا کچھ تعلق پشاچہ زبان سے بھی ہے۔

جلپسیوں کے آباؤ اجداد پہلی مرتبہ غالباً پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے نکلے اور یہ پہلا قافلہ ایران، ارمینیا اور بازنطینی سلطنت سے گذرتے ہوئے یورپ پہنچا۔ مشرقی یورپ میں یہ لوگ بارہویں صدی عیسوی میں داخل ہوئے۔ اور پھر وہاں سے مغربی یورپ کا رُخ کیا۔

جلپسیوں کا ایک دوسرا گروہ آرمینیا میں ٹھہر گیا جہاں ان کی زبان درمیانی عہد کی ہند آریائی زبان کے بالکل مشابہ رہی۔ مگر ساتھ ہی ارمینی زبان سے بھی متاثر ہوتی رہی۔

ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں اور جپسی بولیوں میں ماخذ و اشتقاق کے لحاظ سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ مگر چونکہ یہ دونوں بالکل جدا جدا طریقوں پر نشو و نما پاتی رہی ہیں۔ اس لیے جدید ہند آریائی زبانوں کے بیان میں ان پر زیادہ بحث نہیں کی جاتی۔

شمالی مغربی گروہ



جنوب مغربی جنوب مغربی گروہ کی زبانوں میں راجستھانی بولیوں کے علاوہ پہاڑی گروہ کی بولیاں بھی شامل ہیں۔ جو ان کھاشا قبیلوں میں رائج ہیں جو ہمالا کی پہاڑیوں میں مغرب سے مشرق تک پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۔ راجستھانی گروہ کی چار شاخیں ہیں۔ ۱۔ مالوی اور نماڑی، ۲۔ میواتی اور گجراتی۔ ۳۔ جے پوری اور ہاڑوتی، ۴۔ مغربی شاخ (جس میں مارواڑی اور گجراتی شامل ہیں۔)

راجستھانی بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۱۴ ملین ہے۔ یہ سب زبانیں (جنمیں گجراتی بھی شامل ہے) ہند آریائی خاندان کی اس شاخ میں شامل ہے جو ابتدائی عہد میں مالوہ اور گجرات میں رائج تھی جس پر اس زمانے میں وسط ہند کی ہمسایہ سوارسینی زبان کا اثر پڑتا رہا اور جو گجرات کے ان قدیم قبیلوں سے بھی متاثر ہوئی جو غالباً پشاچہ نسل سے تھے اور جو شمال مغرب سے ہجرت کرکے راجپوتانہ اور گجرات میں سکونت پذیر

ہو گئے تھے۔

راجستھانی کی مغربی شاخ کی زبانیں یعنی مارواڑی اور گجراتی ایک دوسرے سے بالکل قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے برخلاف مشرقی شاخ کی زبانیں یعنی مالوی، میواتی اور جے پوری وغیرہ مغربی ہندی سے قریب ہیں۔ یہ قربت اس درجہ ہے کہ بعض دفعہ شبہہ پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا یہ زبانیں ماخذ کے لحاظ سے مغربی ہندی سے متعلق ہیں یا مغربی راجستھانی یعنی گجراتی ہے۔

گجراتی زبان سولھویں صدی عیسوی سے علیحدہ اور مستقل حیثیت حاصل کرنے لگی اس کے جنوب اور مشرق میں مرہٹی اور خاندیسی علاقے ہیں۔ شمال میں مارواڑی اور مغربی ہندی بولنے والے اور مغرب میں کچھی آباد ہیں۔ گجراتی کے موجودہ بولنے والوں کی تعداد تقریباً دس ملین ہے۔ گجرات کا پہلا بڑا شاعر نرسنگھ مہتا ہے جو پندرہویں صدی میں موجود تھا۔ مگر اس کی مقبول عام نظموں کی زبان مرور ایام کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ گجرات میں جب مظفر شاہی سلطنت قائم تھی تو وہاں بھی ہندوستانی یعنی اردو زبان ادبی مقاصد کے لئے استعمال کی گئی۔ اسی زمانے سے گجراتی پر اردو اور فارسی دونوں کا اثر پڑتا رہا ہے۔

راجستانی کی دوسری بولیاں ادبی مقاصد کے لئے بہت کم استعمال کی گئی ہیں. کیونکہ راجپوتانہ میں وسط ہند کی زبانوں اور خصوصاً برج بھاشا کو ہمیشہ خاص وقعت حاصل رہی ہے۔ قدیم زمانے میں سوراسینی پراکت اور سوراسینی اپبھرنشا نے راجپوتانہ اور گجرات کی اصل آریائی بولیوں پر اپنا اثر جمائے رکھا۔ راجپوتانہ کے شعرا نے قدیم مغربی ہندی کے عہد کی ادبی زبان، "اوٹھا" یا "پنگا" کی اسی طرح ادبی خدمت

کی جس طرح کہ انھوں نے اپنی ملکی یعنی راجستانی زبان "ڈنگلا" اور خاص کر مارواڑی کی خدمت کی۔ موجودہ زمانے میں ان مقامات کی واحد ادبی زبان "ہندی" ہے۔

تاہم اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ راجستانی اور خاص کر مارواڑی زبان میں اچھا ادبی ذخیرہ موجود ہے جس کا زیادہ تر حصہ شاعری اور قصوں پر مشتمل ہے۔ اس ادب پر اٹلی کے ایک مشہور مستشرق ٹیسی ٹوری نے بہت اہم اور مفید تحقیقات کی ہیں۔ اس نے مارواڑی کی چند نفیس نظمیں مرتب کر کے شائع بھی کیں۔

ب۔ پہاڑی گروہ ہند آریائی زبانوں کے جنوب میں مغربی حصے کی دوسری شاخ ہے۔ یہ موضوع بہت بحث طلب رہا ہے۔ گریرسن کے خیال کے مطابق ان کھاشہ قبیلوں کی اصلی زبان جو مغربی ہمالیہ سے جا کر مشرقی پہاڑی علاقوں میں آباد ہو گئے تھے "پشاچہ گروہ" کی ایک شاخ تھی۔ اور پشاچہ کی طرح کھاشہ بھی در اصل آریا تھے۔ جو ہندو معاشرت سے بہرہ ور نہ ہوئے۔

میدانوں کے رہنے والے اور خصوصاً راجپوتانے کی ہند آریائی زبانیں بولنے والے جب سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں ہجرت کر کے پہاڑوں میں جا بسے تو وہاں انھیں کھاشہ قبیلوں سے سابقہ پڑا جو بہت جلد ان کے زیر اثر آ کر ہندیت کی طرف اس قدر مائل ہو گئے کہ اپنی اصلی زبان بھی مسخ کر لی۔ یہی مسخ شدہ زبان جو پشاچی اور ہند آریائی یعنی "راجستانی" بولیوں سے مرکب ہوئی آج "پہاڑی" کہلاتی ہے

اسی طرح کی زبان کشمیری بھی ہے جو در اصل پشاچی ہے مگر ہند آریائی (پنجابی) عناصر سے مل کر مرکب ہوئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کشمیری اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ اس کی اصلی خصوصیات اب بھی باقی ہیں۔ پہاڑی گروہ تین شاخوں میں تقسیم کیا

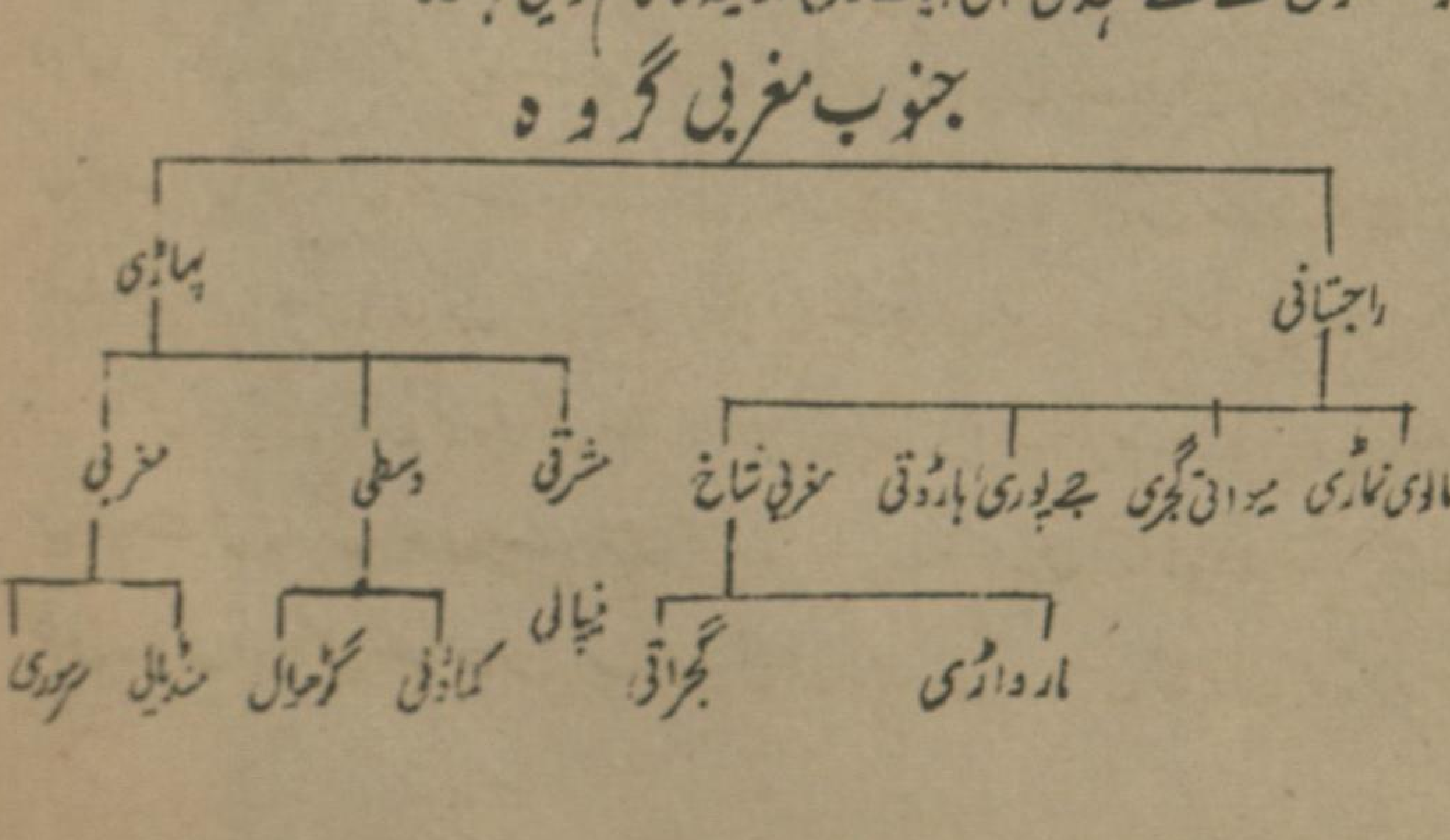
جاتا ہے۔ مشرقی (نیپالی) ۲۔ وسطی (کماؤنی اور گڑھوالی) ۳۔ مغربی (منڈیالی، سرموری وغیرہ)

پہاڑی زبانوں میں سب سے زیادہ اہم "نیپالی" ہے جس کو پربتیا یا گورکھالی بھی کہتے ہیں۔ دوسری پہاڑی زبانیں لسانیاتی نقطۂ نظر سے دلچسپ ہیں۔ مگر زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ نیپالی بولنے والوں کی تعداد نامعلوم ہے۔ مگر دوسری پہاڑی زبانیں بولنے والے تقریباً دو ملین ہیں۔

علاقہ نیپال میں نیپالی یا پربتیا کے علاوہ "تبت برمی" شاخ کی بولیاں بھی رائج ہیں۔ مگر نیپالی ان کو آہستہ آہستہ ناپید کرتی جا رہی ہے۔ یہ زبان زیادہ قدیم نہیں ہے اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری زمانے سے پہلے اس کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ یہ دراصل مغربی نیپال سے پھیلنی شروع ہوئی ہے۔

وسطی پہاڑی زبانوں میں کماؤنی اور گڑھوالی قابل ذکر ہیں۔ مگر ان میں اور ان کے علاوہ پہاڑی کی مغربی شاخ میں کوئی قابل ذکر ادب موجود نہیں ہے۔ یہاں کی ادبی کوششوں کے لئے "ہندی" ہی ایک معین ذریعہ کا کام دیتی ہے۔

جنوب مغربی گروہ



ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانیں

وسطی وسطی ہند آریائی زبان کا عام نام مغربی ہندی" ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد ساڑھے اکتالیس ملین ہے۔ اس کی اہم قسمیں پانچ ہیں۔ ۱۔ برج بھاشا وہ بولی ہے جو بریلی، علیگڈھ، آگرہ، متھرا، دھولپور اور کرولی کے اطراف واکناف میں رائج ہے۔ ۲۔ قنوجی، جو بالائی دوآبہ میں برج بھاشا علاقہ کے مشرق میں بولی جاتی ہے۔ ۳۔ بندیلی بندیلکھنڈ اور وسط ہند کے علاقوں میں رائج ہے۔ ۴۔ بانگڑ دیا ہریانی جو جنوب مشرقی پنجاب میں بولی جاتی ہے۔ ۵۔ ہندوستانی جو برج بھاشا علاقہ کے شمال میں انبالہ سے رامپور تک بولی جاتی ہے۔ اس کو کھڑی بولی اور ہندی بھی کہتے ہیں۔

مغربی ہندی کا قدیم ترین نمونہ جس کا کچھ حصّہ چھپ بھی چکا ہے۔ چند بروے کی نظم "پرتھی راج راسو" ہے۔ یہ نظم اُنہتر (۶۹) بندوں پر منقسم ہے، اور اس میں شہاب الدین غوری اور پرتھی راج کے معرکے بیان کیئے گئے ہیں۔ چند لاہور کا باشندہ تھا۔ اور یہ شہر اس زمانے سے ایک سَو ستر سال پہلے ہی یعنی ۱۰۲۳ عیسوی سے مُسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ اس لئے چند کی زبان میں فارسی الفاظ کافی پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ کتاب کو امر سنگھ میواڑی نے شروع سترھویں صدی میں مرتب کیا۔ گویا مصنّف کی وفات سے چار سو سال بعد۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس وقت تک اصل زبان میں کچھ ترمیم واضافہ ہوگیا ہو۔ تاہم اس میں چند کی زبان ضرور موجود ہے۔ وہ رزم وبزم دونوں کا ذکر جوش وتازگی سے کرتا ہے۔ اس لئے اسلوب میں جگہ جگہ دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس اہم نظم کے علاوہ قدیم مغربی ہندی کے نمونے چند بھگت یا وشنو پرست غیر برہمن مصنفوں کے مذہبی کلام سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس نے ملک کی زبان اور شاعری کو ایک حد تک ضرور متاثر کیا۔

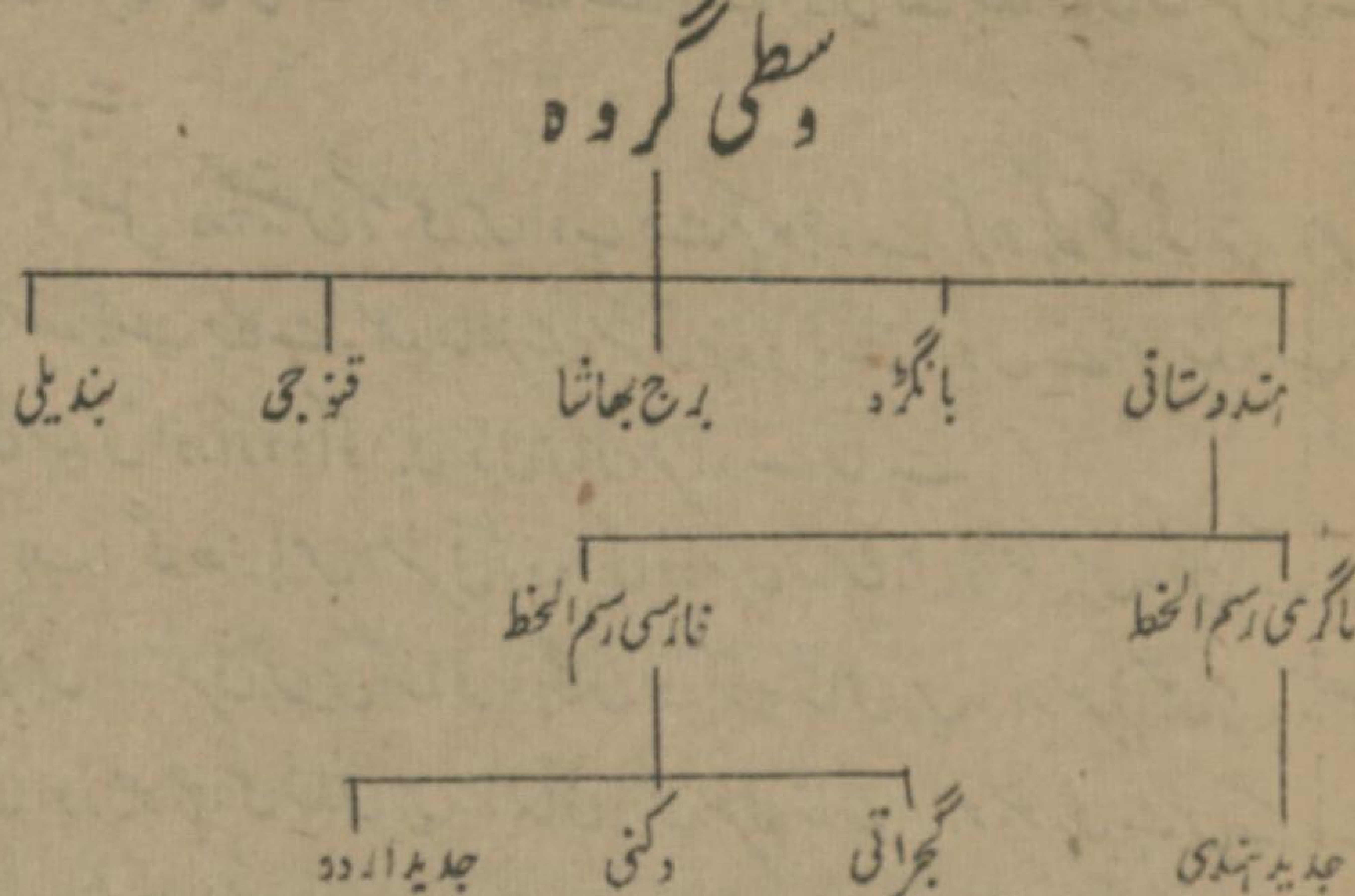
ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانیں

مغربی ہندی کے ادبی ذخیرہ میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں بیش قیمت اضافے ہوئے خود بادشاہ کا دربار شاعری کا مرکز تھا۔ تان سین، بیربل، عبد الرحیم خانخاناں اور فیضی کی ہندی شاعری خاص و عام میں مقبول تھی۔ افسوس ہے کہ ان کے کلام آج مفقود ہیں۔ عہد اکبر کے جو ادبی نمونے محفوظ ملتے ہیں۔ ان میں سور داس اور بہاری لال کے کارنامے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خاص کر سور داس کے بھجن دسور ساگر تو برج بھاشا شاعری کا نہایت اعلیٰ نمونے سمجھے جاتے ہیں۔

برج بھاشا اپنے ماخذ "قدیم سورسینی" زبان کی نہایت وفادار اور اہم ترجمان ہے یہ زبان اور اودھی (جو مشرقی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جس کا ذکر آگے آرہا ہے) قریبی زمانہ تک بالائی دوآبہ گنگا کی ادبی زبانیں تھیں۔ مگر جب سے ہندوستانی (اردو اور ہندی) کا وجود ہوا۔ یہ کم لکھی جانے لگیں۔

ہندوستانی کا تعلق اسی مغربی ہندی سے ہے۔ مگر چونکہ اس کتاب میں ہندستانی پر علحدہ عنوان کے تحت بحث کی جائے گی۔ اس لئے مغربی ہندی اور خاص کر برج بھاشا اور ہندوستانی میں جس قسم کا تعلق ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر وہیں کیا جائے گا۔

برج اور قنوجی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ برج بھاشا کا اصلی وطن متھرا اور اس کا نواح ہے جو شمال کی طرف بلند شہر (مغرب) اور بریلی (مشرق) تک اور جنوب میں ریاست گوالیار کے شمالی حصہ تک چلا گیا ہے۔ مغربی ہندی گردہ ہندستانی زبانوں کی تاریخ میں خاص اثر رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ اس پراکرت کی نسل ہے جو سنسکرت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ اس حصہ ملک میں رائج ہے جو مدھیادیس کہلاتا ہے اور ابتدا سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہا ہو۔



مشرقی مشرقی گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ ۱۔ مشرقی ہندی۔ ۲۔ مگدھی۔ مشرقی ہندی کو مغربی ہندی بولنے والے "پوربیا" کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ اودھی جس کو کوسلی اور بیسواڑی بھی کہتے ہیں۔ ۲۔ باگھیلی، ۳۔ چھتیس گڑھی۔

مشرقی ہندی بولنے والوں کی تعداد ساڑھے بائیس ملین سے زیادہ ہے۔ یہ زبان صوبجات متحدہ وسط ہند اور صوبۂ متوسطہ میں "مغربی ہندی" علاقہ کے مشرق میں بولی جاتی ہے۔ اودھی میں کافی ادب موجود ہے۔ اس کا قدیم ترین اہم کارنامہ ملک محمد جائسی کی پدماوت ہے۔ اس کے علاوہ تلسی داس نے بھی زیادہ تر اودھی میں لکھا ملک محمد جائسی مذہبی آدمی تھے۔ امیٹھی کا راجہ ان کی دعوت کرتا تھا۔ انھوں نے سنہ ایک ہزار چوّن ہجری میں پدماوت لکھی۔ جس میں علاؤالدین خلجی کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو پدمنی کو حاصل کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی تھیں۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے

ہندی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اور مصنف نے بجائے ایرانی کے ہندوستانی عناصر ہی سے کام لیا ہے۔

باگھیلی اور چھتیس گڑھی میں ادب بہت کم موجود ہے۔ مگر جو کچھ لکھا گیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ چھپ چکا ہے۔ عہد حاضر میں مشرقی ہندی بولنے والوں نے بھی ہندوستانی (یعنی ہندی اور اُردو) کو اپنی ادبی زبان قرار دے لیا ہے۔

(ب) مگدھی زبانیں "مشرقی گروہ" کی دوسری شاخ میں داخل ہیں۔ اُن کے دو جتھے ہیں: ۱۔ مشرقی جس میں آسامی، بنگالی اور اُڑیہ شامل ہیں۔ ۲۔ مغربی جس میں میتھلی مگھی اور بھوجپوری شامل ہیں۔ اس کی بالکل مغربی شاخ "بھوجپوری ہے جس کے بولنے والے ساڑھے بائیس ملین ہیں۔ اس زبان کا رقبہ مرزاپور، جونپور اور فیض آباد کے مشرقی حصوں سے شروع ہو کر سون اور گندھک ندیوں تک چلا جاتا ہے۔

اس کی ایک قسم مگھی ہے جو اضلاع گیا، پٹنہ، مونگیر اور ہزاری باغ میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے ساڑھے چھ ملین ہیں۔

میتھلی بولنے والوں کی تعداد دس ملین ہے۔ یہ لوگ گنگا کے شمال میں، بہار میں اور جنوب میں اضلاع مونگیر، بھاگلپور اور سنتال پرگنوں میں آباد ہیں۔ شمال کی طرف یہ بنگال میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہ بولی "مگدھی" کی مغربی زبانوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

مگدھی زبانوں کا دوسرا جتھا نہایت اہم ہے۔ کیونکہ اسی میں اُڑیا، آسامی اور بنگالی زبانیں شریک ہیں۔ اُڑیا بولنے والے دس ملین ہیں جو جنوب مغربی بنگال، اڑیسہ اور انکے علاوہ چھوٹا ناگپور، صوبجات متوسط اور مدراس کے شمالی حصوں میں آباد ہیں۔

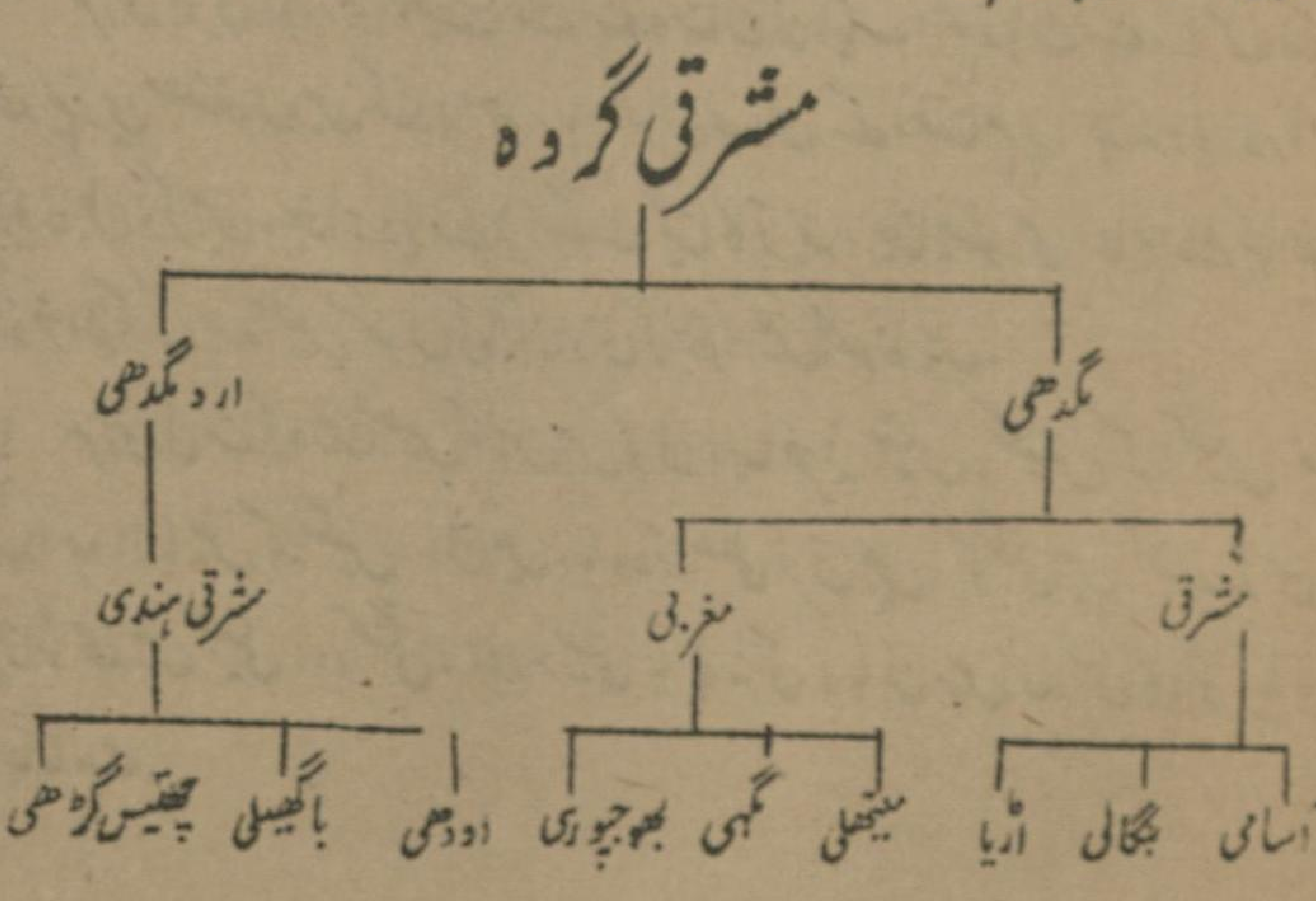
آسامی وادی آسام میں رائج ہے اور ڈیڑھ ملین آدمیوں کی زبان ہے۔ اسکی دو

شاخیں ہیں۔ ایک مشرقی جو سیوساگر میں مستعمل ہے اور دوسری مغربی۔

بنگالی صوبہ بنگال کے جنوب کی زبان ہے۔ مگر چھوٹا ناگپور اور وادیٔ آسام میں بھی رائج ہے۔ عہد حاضر میں بنگالی کی دو جدا جدا اور باضابطہ شاخیں بن گئی ہیں۔ ایک تعلیم یافتوں کی زبان جو سنسکرت سے زیادہ متاثر ہے۔ اور دوسری عوام کی زبان مگر بنگالی کی اصلی لسانی شاخیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کلکتہ اور اس کے اطراف و اکناف کی مرکزی زبان۔ ۲۔ رنگ پور، میمن سنگھ اور ڈھاکہ کی مشرقی زبان۔ ۳۔ ندیہ اور چوبیس پرگنہ کی مغربی زبان۔

بنگالی اپنے ادبی ذخیرہ کے لحاظ سے ہندوستان کی اہم ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ انگریزی تسلط کے بعد سے اس نے خاص ترقی حاصل کر لی ہے اور ہندوستان کے بعد ادب اور علوم و فنون دونوں کے لحاظ سے بنگالی ہندوستان کی سب سے زیادہ قابل وقعت زبان ہے۔



جنوبی جنوبی گروہ ہند آریائی زبانوں کی آخری شاخ ہے۔ اس میں صرف مرہٹی اور اس کی یہ تین بولیاں شامل ہیں۔ ۱۔ دیشی یا پونہ مرہٹی جو میاری اور وسطی زبان ہے۔ اور خاص دکن میں بولی جاتی ہے۔ ۲۔ کونکنی یا ساحلی بولی جس کی آواز وں میں اکثر انفی عنصر غالب رہتا ہے۔ ۳۔ براڑی ناگ پوری یا مشرقی بولی جس کا تلفظ ذرا کھلا اور بگڑا ہوتا ہے۔

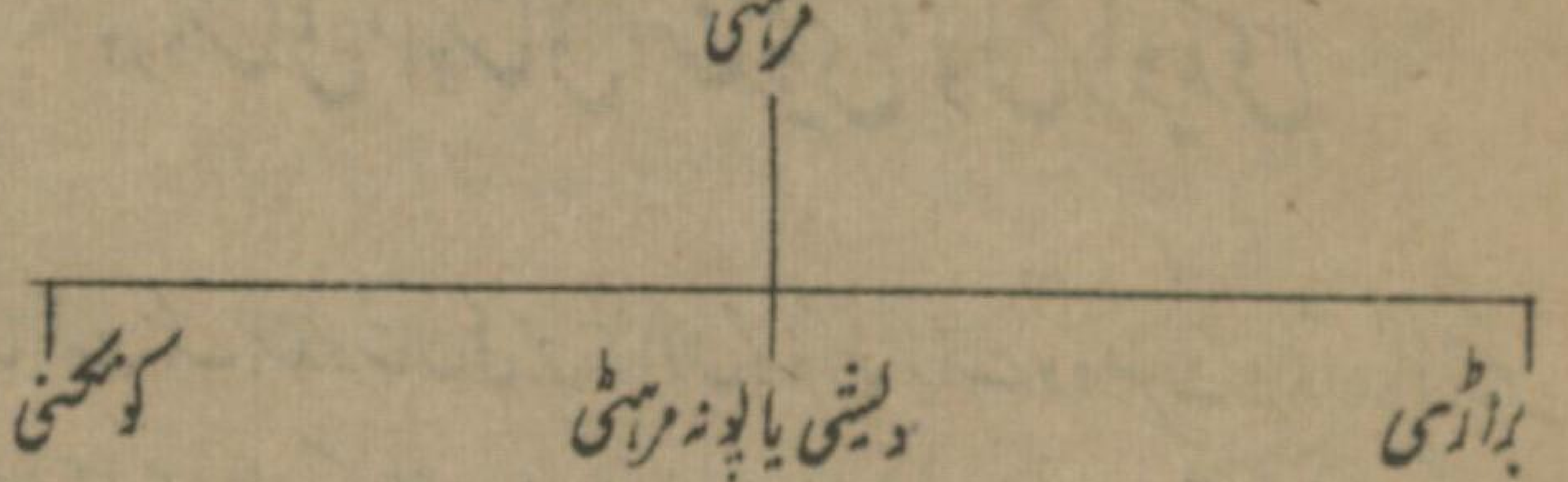
گوا کے نواح میں جو زبان بولی جاتی ہے۔ اس کا نام بھی کونکنی ہے۔ اگرچہ وہ مرہٹی ہی کی ہم نسل ہے۔ مگر چند خصوصیتوں کی وجہ سے اس سے متفرق بھی ہے۔

مرہٹی زبان بولنے والوں کی تعداد بیس ملین کے قریب ہے۔ یہ لوگ دکن میں بمبئی کے ساحل پر اور برار، حیدرآباد اور صوبہ متوسطہ میں پھیلے ہوئے ہیں اسکے جنوب میں کنڑی علاقہ ہے۔ جنوب مشرق اور مشرق میں تلنگانہ اور چھوٹا ناگپور ہے اور شمال میں وندھیا اور ست پڑا کے پہاڑ ہیں۔

مرہٹی ادبی اور علمی حیثیت سے ہندوستان کی ایک اہم زبان ہے۔ اس کے قدیم ترین مصنفوں میں مکندراجہ (بارھویں صدی کے اختتام پر) جنانہ دیو اور نام دیو قابل ذکر ہیں۔ جانہ دیو نے "بھگوت گیتا کا ترجمہ" جانیشوری" نام سے کیا تھا مؤخر الذکر کی چند نظمیں سکھوں کی "آزادی گرنتھ" میں محفوظ ہیں۔

مرہٹی کی متذکرہ تین قسمیں آپس میں کوئی ایسا فرق نہیں رکھتیں کہ انھیں ہم جدا جدا زبانیں کہہ سکیں۔ ان میں زیادہ تر لفظی فرق ہیں۔ کونکنی میں کنڑی، براڑی میں بھیلی اور تلنگی، اور دیشی یا پونہ کی زبان میں فارسی کا اثر پایا جاتا ہے۔

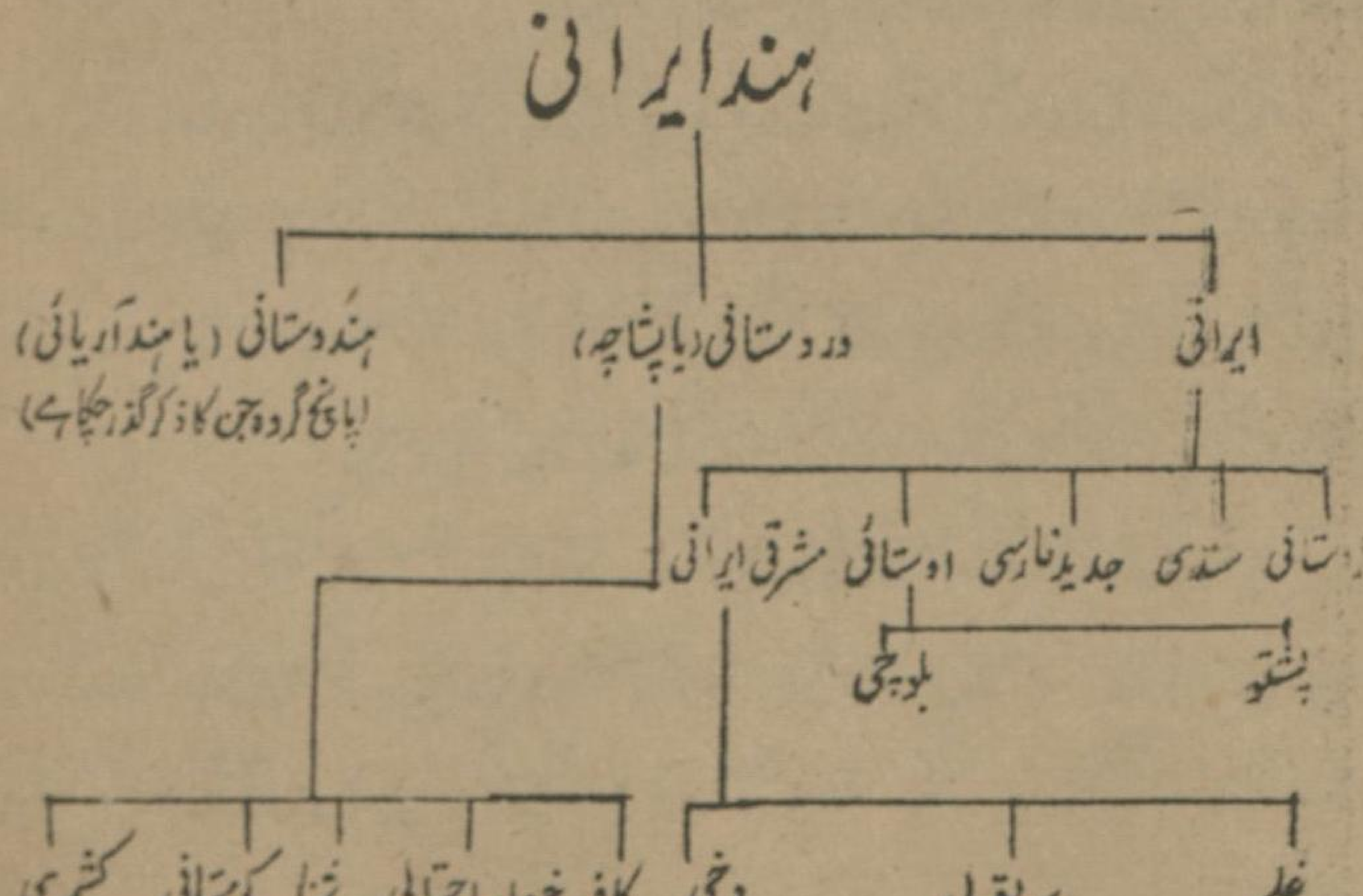
جنوبی گروہ



ہندوستان کی غیر ہند آریائی زبانیں

دردستانی، اوستانی، ہند چینی، کول دراوڈی

اس وقت تک ہندوستان کی جن زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف ہند آریائی تھیں۔ مگر اس سرزمین میں ان کے علاوہ اور کئی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ جن کا تعلق دیگر خاندان السنہ سے ہے۔ مثلاً ہندوستان کے بالکل شمال میں اور شمال مغرب کے سرحدی مقبوضات میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں وہ ہند ایرانی خاندان کی دوسری شاخ دردیا پشاچہ سے متعلق ہیں ہند ایرانی کے تین گروہ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:-



پشاچہ زبانوں کے تین بڑے بڑے گروہ ہیں۔ پہلے گروہ میں کافر پشکلی، وی الا، ویس ویری، کلاشا، گواربتی اور پشتی زبانیں شامل ہیں۔ یہ سب شمال مغربی سرحدوں پر بولی جاتی ہیں۔ دوسرے میں خوار یا چترالی زبان شامل ہے۔ اور تیسرا گروہ شنا (جس کی سات شاخیں ہیں) اور جس پر ڈاکٹر گراہم بیلی نے لسانیاتی تحقیقات شائع کی ہیں۔ اکوہستانی (جس کی تین شاخیں ہیں) اور کشمیری زبانوں پر مشتمل ہے۔ جو پنجاب کے کے شمال میں رائج ہیں۔

اوستائی ہندوستان کی دوسری غیر ہند آریائی زبانیں" ایرانی" کی شاخ اوستائی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس کو قدیم باختری یا قدیم میدیائی بھی کہا جاتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک پشتو اور دوسری بلوچی۔ دونوں زبانیں ہندوستان کے مغربی اور شمال مغربی علاقوں میں مستعمل ہیں۔ یہ زبانیں بھی کوئی ادبی اہمیت نہیں رکھتیں کیوں کہ ان علاقوں کی ادبی زبان یا تو فارسی ہے یا ہندوستانی یعنی اردو۔

تیسری غیر ہند آریائی زبانیں ہندوستان کے مشرقی اور شمال مشرقی حصوں میں بولی جاتی ہیں۔ ان کا تعلق تبتی چینی خاندان السنہ سے ہے۔ قدیم زمانہ میں تبت چینی بولنے والے۔ ہمالیہ کے جنوبی میدانوں، بنگال کے شمالی اور شرقی حصوں اور آسام میں عام طور سے آباد تھے۔ مگر جب آریا ہندوستان کے مشرقی حصوں میں گھسنے لگے۔ تو ان کو پیچھے کی طرف ہٹنا پڑا۔ مگر آریاؤں کا سیلاب انھیں پوری طرح بھگا نہ سکا اور وہ آج تک ان علاقوں میں آباد ہیں۔ یہ تبتی چینی بولنے والے ابتدا میں مونڈا یا کول اور دراویڈی اثرات قبول کر چکے تھے۔ اور جب آریا آئے تو ان سے بھی متاثر ہونے لگے۔ چینی قوم دنیا کی ان چند قدیم قوموں میں سے ہے۔ جنھوں نے

تہذیب و تمدن کے ارتقا میں کافی مدد دی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں جو چینی آئے اور یہاں آکر آباد ہو گئے۔ وہ ذہنی اور تمدنی ارتقا سے محروم تھے۔ اسی وجہ سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔

آسٹری ہندوستان کی چوتھی غیر ہند آریائی زبانیں آسٹری خاندانِ السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس خاندان کی زبانیں ہندوستان کے متفرق مقامات کے علاوہ ہند چین، جزیرہ نمائے ملایا، انڈونیزیا، میلینزیا اور پولینزیا میں بولی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں آسٹری خاندان کی زبانوں کو مونڈا یا کول زبانیں کہتے ہیں۔ ان کے بولنے والے اگرچہ عہدِ حاضر میں صرف گنگا، تاپتی اور گوداوری کے علاقوں یعنی مغربی بنگال، چھوٹا ناگپور، صوبہ مدراس کا شمالی شرقی حصّہ اور صوبۂ متوسط میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن کسی زمانہ میں دوآبہ گنگ وجمن اور ہمالیہ کے دامنوں میں بھی آباد تھے۔ ان پر ان سے زیادہ متمدن ڈراویڈیوں کا اثر پڑتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر میدان کے رہنے والے تو انھیں میں ضم ہو گئے۔ اور جب آریا آئے۔ تو وہ اور ان کے ساتھی ڈراویڈی یا تو ان علاقوں سے بھاگ گئے یا پھر وہیں رہ کر آریائی زبان اختیار کر لی اور برہمنوں کی ذات پات کی تقسیم میں شامل کر لئے گئے۔

جو کول قبیلے وسط ہند کے دور دراز حصوں میں رہتے تھے۔ اور آریاؤں یا آریاؤں سے متاثر شدہ لوگوں سے ملنے جلنے نہیں پائے تھے۔ وہ اپنی قدیم زبانیں محفوظ رکھ سکے۔ جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

سنتھال، مونڈا، ہو، کورکو وغیرہ۔ بھیل بھی کول ہی ہیں۔ مگر انھوں نے آریائی

زبان اختیار کرلی اور برہمنوں کی ذات پات کی تقسیم میں شامل کر لئے گئے

جو کول قبیلے وسط ہند کے دور دراز حصّوں میں رہتے تھے۔ اور آریاؤں یا آریاؤں سے متاثر شدہ لوگوں سے ملنے جلنے نہیں پائے تھے۔ وہ اپنی قدیم زبانیں محفوظ رکھ سکے جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

سنتھال، مونڈا، ہو، کورکو وغیرہ۔ بھیل بھی کول ہی ہیں۔ مگر انھوں نے آریائی زبان اختیار کرلی ہے۔

آسام میں کھاسی بھی انھیں کولوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا وہاں پایا جانا اِس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کول زبانیں بولنے والے کسی زمانہ میں وادیٔ گنگا سے کمبوجیا تک آباد ہوں گے۔ یہ زیادہ تر غیر متمدن تھے اور ان کی زبانیں بھی محدود ہی رہیں۔

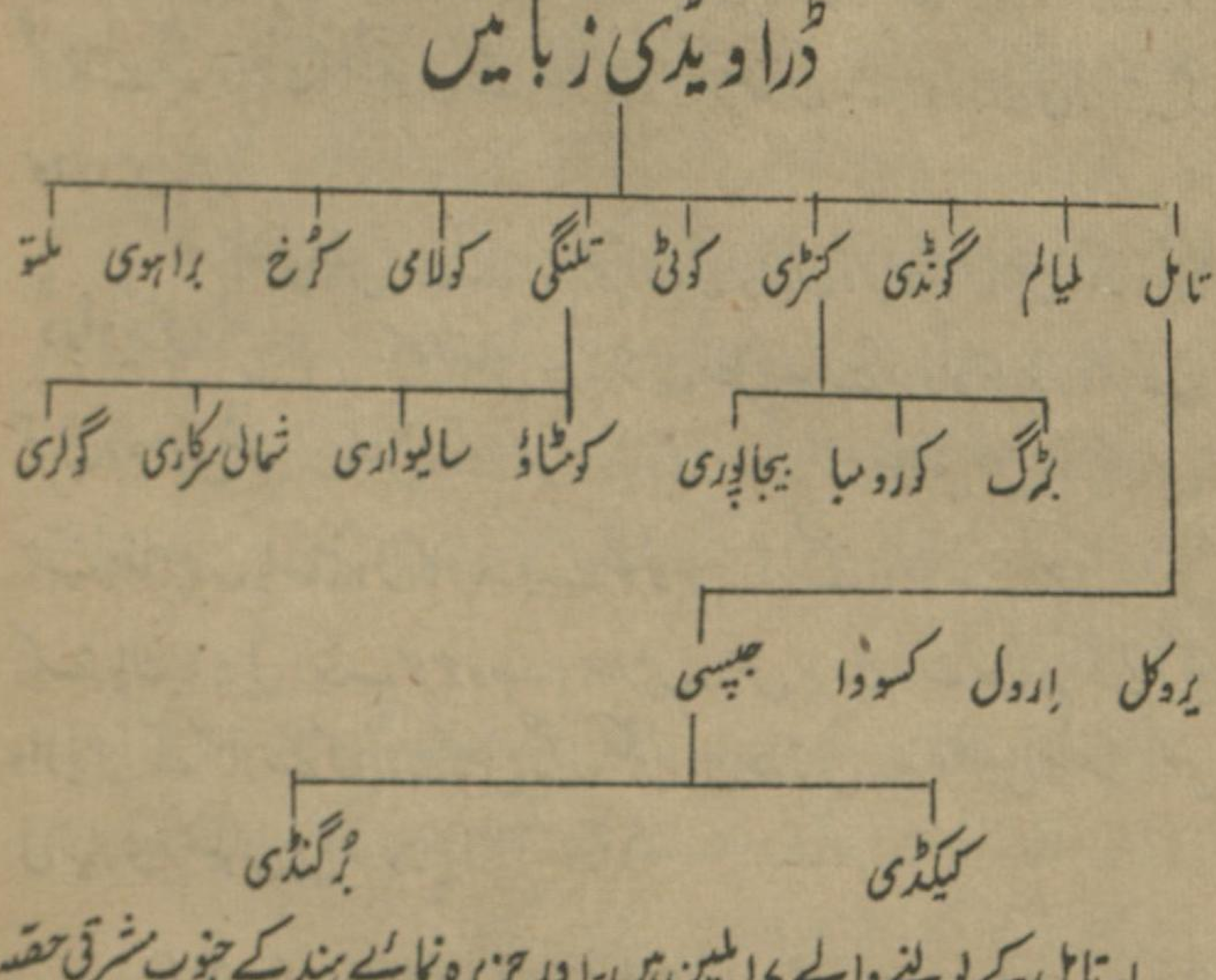
ڈراویڈی

آخری لیکن سب سے اہم غیر آریائی زبانیں ڈراویڈی ہیں۔ ڈراویڈوں کے آغاز کے متعلق جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ وہ بحیرۂ روم کے قرب وجوار کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک عرصہ تک عراق میں رہ چکے ہیں۔ جب ہقادیوں یا سامیوں کا دباؤ پڑنے لگا تو بلوچستان کے راستہ سے (جہاں انکی ایک زبان براہوئی ابتک موجود ہے) ہند میں داخل ہوئے۔ سندھ اور گنگا کی وادیوں کے کنارے کنارے پھیل گئے۔ لیکن ان علاقوں سے انھیں از منۂ ماضی کی سیاہ فام نسلوں میں ضم ہونا پڑا۔[1]

[1] J. HORNELL. MENTOIRS OF THE A.S.B 1920. VOL. VII NO 3

ڈراویڈوں نے دکن میں بڑی قوت حاصل کرلی اور دریائے کاویری کے اطراف میں ان کا تمدن پھیلنے لگا۔ ڈراویڈوں کے متعدد گروہ تھے جن میں کنڑی، تلنگی، تامل اور ملیالم بولنے والے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ تھے۔ ان کے غیر متمدن قبیلوں میں براہوی، گونڈ اور اوراؤں کا شمار کیا جاتا ہے جو ممکن ہے ابتدا میں کول ہوں، لیکن ڈراویڈی زبان اختیار کرلی اور ہمیشہ ڈراویڈوں سے جدا اور ترقی سے محروم رہے۔

ڈراویڈی زبانیں کئی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے :-



۱۔ تامل کے بولنے والے، املین ہیں۔ اور جزیرہ نمائے ہند کے جنوب مشرقی حصہ اور سیلون کے شمالی نصف حصہ میں آباد ہیں۔ اس کے شمال میں تلنگی اور مغرب میں

کنڑی اور ملیالم بولی جاتی ہیں۔ جنوب اور مشرق میں سمندر ہے۔ سیلون میں یہ زبان نہایت قدیم زمانہ میں پہنچی تھی۔

تامل کی کئی شاخیں ہیں۔ کسی زمانہ میں ملیالم کو بھی اسی کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ تامل ہر جگہ ایک طرح سے نہیں بولی جاتی۔ اس میں بول چال کی اور ادبی بولیاں جدا جدا ہیں اور ان کے علاوہ متفرق مقامات کی بولیوں کے لحاظ سے بھی تامل کی چار قسمیں ہیں۔

ا۔ یروکل جو خانہ بدوشوں کی زبان ہے۔

ب۔ کسووا جو نیلگری کے دامنوں کے ایک جنگلی قبیلہ کی زبان ہے۔

ج۔ اردل، نیلگری کے اطراف واکناف کی ایک ذات میں مستعمل ہے۔

د۔ جپسیوں کی زبان۔ جس کی دو قسمیں ہیں۔ کیکڈی اور بُرگنڈی۔

تامل پہلی ڈراوڈی زبان ہے جس میں ادب کی نشوونما ہوئی۔ یہ سنسکرت سے بالکل بے نیاز رہی اور قدیم ترین زمانہ سے لکھی جانے لگی ہے۔

۲۔ ملیالم کے بولنے والے چھ ملین ہیں اور یہ زبان جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر شمال میں سرگودو سے جنوب میں تری وندرم تک بولی جاتی ہے۔ اس کے مشرق میں مغربی گھاٹ ہیں۔ اور مغرب میں بحیرۂ عرب۔

یہ ابتدا میں تامل کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی۔ مگر بعد میں اس نے اس قدر علیحدگی پیدا کر لی کہ ماہرین لسانیات اس کو بالکل علیحدہ زبان قرار دینے لگے ہیں۔

ڈراوڈی خاندان کی دوسری زبانوں کی طرح اس میں بھی بول چال کی اور ادبی دو جدا جدا بولیاں ہیں۔ ادبی بولی تامل سے زیادہ قریب ہے۔ تامل ہی ایک ایسی ڈراوڈی

زبان ہے جس پر سنسکرت کا بہت کم اثر پڑا اور ملیالم اور اس کے درمیان اسی امر کا فرق ہے کیونکہ ملیالم سنسکرت سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اس کی بعض کتابوں کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دراصل سنسکرت کی ہیں۔ البتہ کہیں ملیالم لفظ آجاتے ہیں۔

ملیالم کی مستقل بولیاں نہیں ہیں۔ اس میں تیرھویں یا چودھویں صدی عیسوی سے ادب لکھا جانے لگا ہے۔ ابتدا میں تامل اور سنسکرت شاعری کی نقل تھی۔ لیکن سترھویں صدی عیسوی سے اس کے ادب اور رسم الخط دونوں کو خاص حیثیت حاصل ہوگئی

۴۔ کنڑی کے بولنے والے قریباً دس ملین ہیں اور میسور اور اس سے ملحقہ کوئمبٹور کے حصوں سیلم، اننت پور، بلاری، ریاست نظام کے جنوب مغربی علاقہ میں بیدر تک، ستارہ کے انتہائی جنوب مشرق اور مغرب میں کولھاپور تک آباد ہیں۔ یہ لوگ مدورا اور صوبہ متوسط میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ اس کے شمال اور مغرب میں مرہٹی اور اس کی بولی کونکنی، مشرق میں تلنگی، اور تامل اور جنوب میں تامل کوڈگو اور تولو بولی جاتی ہیں۔

اس کی بولیوں کا آپس میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ سب سے اہم بولی بڈگ ہے۔ جو نیلگری میں بولی جاتی ہے اور کنڑی سے بھی قدیم ہے۔ ایک اور بولی کورما ہے۔ جو معمولی کنڑی سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ بیجاپور کی کنڑی بھی معمولی زبان سے کچھ جدا ہے۔

کنڑی میں بہت قدیم زمانہ سے ادب لکھا جانے لگا تھا۔ دسویں صدی عیسوی کی کتابوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس کے ابتدائی لکھنے والے جین تھے۔ جو بہت کچھ سنسکرت سے بھی متاثر تھے۔

۴۔ تلنگی بولنے والے میں ملین ہیں اور صوبۂ مدراس کے شمالی حصہ اور ریاست حیدرآباد میں جنوب مغربی اضلاع میں آباد ہیں۔ اس کے شمال میں اُڑیا، گونڈی اور مرہٹی، مغرب میں مرہٹی اور کنڑی، اور جنوب میں تامل بولی جاتی ہے۔

تلنگی کی کئی بولیاں ہیں۔ شمالی سرکار میں جو زبان بولی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ فصیح ہے اس کی بعض شاخوں کے نام یہ ہیں۔ کوماٹی، سالیواری، اور گولاری۔ ان کے آپس میں اس قدر کم فرق ہے کہ انھیں بمشکل ہی جدا جدا بولیاں کہا جاسکتا ہے۔

اس کا ادب صرف شاعری پر مشتمل ہے جس کی زبان بول چال کی زبان سے بہت مختلف ہے۔ تلنگی کی قدیم ترین تصنیف گیارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔

۵۔ کُرخ بولنے والے آدھے ملین ہیں اور صوبۂ بنگال کے مغربی علاقہ اور صوبہ متوسط کے ملحقہ حصوں میں آباد ہیں۔ یہ اصل میں کرناٹک کے رہنے والے تھے مگر مسلمانوں کے حملہ کے بعد وہاں سے نکل کر شمال کا رُخ کیا۔ اس کی کوئی خاص شاخیں نہیں ہیں اور نہ یہ ادبی حیثیت رکھتی ہے۔

۶۔ براہوی بولنے والے بلوچستان کے سرَون اور جھلون صوبوں میں پائے جاتے ہیں اس کی کوئی شاخیں نہیں ہیں۔ اور نہ یہ زبان کوئی اہمیت رکھتی ہے۔

ان کے علاوہ اور ڈراویڈی اور نصف ڈراویڈی زبانیں بھی ہیں جو زیادہ اہم نہیں۔ ڈراویڈی زبانوں کے نام یہ ہیں:۔

ملتو، کوئی، کندھی یا کھوند، گونڈی، کولامی یا نیکی

حِصّۂ دُوم

۱۔ ہندوستانی کا آغاز	مواد، مختلف نظریے، جدید تحقیقات
۲۔ ہندوستانی کا ارتقا	سہ مرکزی تفریق۔ اختلاف کے اسباب
۳۔ ادبی بولیاں۔	گجراتی، دکنی، شمالی۔
۴۔ ہندوستان کی ہمہ گیری	فتح دکن، تحریک منظر لکھنؤ کی خدمات۔
۵۔ عہد حاضر	ہندی اردو تقسیم، رجحانات اور ضرورتیں

ہندوستانی کا آغاز

مواد، مختلف نظریے، جدید تحقیقات

اس وقت تک ہندوستانی کے آغاز کے متعلق بہت کم حکمی تحقیقات کی گئی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس موضوع کی نسبت آج تک بہت کم مواد موجود ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ آغاز سے قریبی عہد کی نہ تو تصنیفات موجود ہیں۔ اور نہ ان کے متعلق بعد کی کتابوں سے کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مواد ہندوستانی کی ساخت اور آغاز و ارتقا کے متعلق جو مواد اس وقت موجود ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ قدیم تذکرے۔ ۲۔ فرانسیسی اور انگریزی تصنیفات۔ ۳۔ عہد متوسط کی تحریریں
۴۔ عہد حاضر کی تحقیقات

پہلی قسم کا مواد اردو شعر و شاعری کے ان تذکروں پر مشتمل ہے جو زیادہ تر فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں اور جن میں سوائے اردو شاعروں پر ایک سطحی نظر ڈالنے کے کوئی اہم تاریخی مواد نہیں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم بعض تذکروں (مثلاً تذکرۂ میر حسن، نکات الشعرا مخزن نکات، تذکرۂ مصحفی، گلزار ابراہیم وغیرہ) کے دیباچہ میں یا اصل متن میں کہیں کہیں ایک دو جملے ایسے آ گئے ہیں جو اردو زبان کے آغاز کی نسبت ان تذکرہ نویسوں کا نقطۂ خیال ظاہر کرتے ہیں۔ انھیں تذکروں کے سلسلہ میں انشاء اللہ خاں کی کتاب

"دریائے لطافت" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو موضوع زیر بحث پر کچھ روشنی ضرور ڈالتی ہو۔

دوسری قسم کے مواد میں سب سے پہلے گارسان وتاسی کے کارنامے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے ایک مکمل تاریخ ادبیات ہندوستانی لکھی۔ اس کے علاوہ اس نے ہماری زبان کے متعلق فرانسیسی میں تقریباً ۳۰ کتابیں شائع کیں۔

اس فرانسیسی محسن کے علاوہ ہمیں متعدد انگریز پرستاران اردو کے نام بھی پیش کرنے ہیں۔ جنھوں نے کسی نہ کسی طرح ہمارے اس موضوع کے متعلق مواد محفوظ کر دیا۔ گلکرسٹ شیکسپیر، فاربس، فیلن، اسپرنگر، اور اسٹوارٹ کے نام تاریخ اردو میں شاید ہی بھلائے جا سکیں گے۔

تیسری قسم کا مواد عہد متوسط کی تحریریں مثلاً میر امن کا دیباچہ "باغ و بہار" آزاد کا مقدمہ "آب حیات" سرسید اور ان کے ہم خیالوں کی بعض عبارتوں اور شرر کے چند مضامین پر مشتمل ہے۔

چوتھی قسم کا مواد عہد حاضر کی تحقیقات ہیں جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پیش کی گئی ہیں۔

انگریزی تحریروں میں گریرسن کا "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (ہندوستانی زبانوں کا تبصرہ) سب سے پہلے قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد پروفیسر ٹرنر، ڈاکٹر بیلی اور پروفیسر جولس بلوک کی تحقیقات ہیں۔ جنھوں نے گذشتہ کے قائم کئے ہوئے متعدد خیالات میں کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ اسی سلسلہ میں پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر عبد اللطیف کا نام لینا ضروری ہے۔ جنھوں نے اردو زبان کے متعلق بھی غور و خوض کیا اور مفید نتیجے پیش کئے ہیں۔ آخر میں رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادبیات اردو" کا ذکر بھی ضروری ہے

ہندوستانی کے متعلق عہد حاضر کی جن اردو کتابوں سے مواد حاصل ہوتا ہے ان میں "اُردوئے قدیم" (حکیم شمس اللہ قادری) ۲۔ "دکن میں اُردو" (نصیر الدین ہاشمی) ۳۔ "پنجاب میں اردو" (پروفیسر حافظ محمود شیرانی) اور ۴۔ "اُردو شہ پارے" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مختلف نظریے ان تمام تحریروں کے مطالعہ کے بعد تحقیقات کرنے والا عجب کش مکش میں پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو قسم قسم کے خیالات اور بیانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان سب میں اردو زبان کے آغاز کو ہندو مسلم میل جول کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس میل جول کے مقام، نوعیت اور پھر نتیجے نکالنے میں یہ سب تحریریں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور اس طرح ہندوستانی کے آغاز کے متعلق جدا جدا نظریے پیش کرتی ہیں۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستانی کا آغاز دکن میں ہوا ساتویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانے میں عرب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت تجارتی اغراض سے سمندر پار کر کے ہندوستان پہنچی اور ساحل مالابار پر توطن اختیار کیا صوبہ مدراس کے بہت سے مسلمان خاندان اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ انھیں عرب تاجروں کی اولاد ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد صرف ساحل مالابار پر نہیں رُکے بلکہ تمام ملک کو عبور کیا اور ہندوستان کے مشرقی سواحل تک پہنچ گئے جہاں انھیں مجبوراً قیام کرنا پڑا۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ اسی ہندو مسلمان میل جول کی وجہ سے ایک زبان بن گئی تھی۔ جو موجودہ اُردو کی ماں تھی۔ اور جس میں ایک ہزار ایک سو عیسوی سے قبل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ یہ خیال کچھ قابل لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ اردو ایک آریائی

زبان ہے۔ اور ان قدیم عرب مہاجرین میں سے اکثروں نے ایک ایسی سرزمین کو اپنا بنایا جہاں ڈراویڈی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان میں سے بعضوں نے مہاراشٹرا میں قیام کیا تو اس قسم کے میل جول کا نتیجہ ایک ایسی زبان ہوتی جو محض عربی اور مہاراشٹری عناصر پر مبنی ہوتی حالانکہ اردو زیادہ تر فارسی سے متاثر ہوئی ہے۔ نہ کہ عربی سے۔

(۲)

دوسرا مقام جہاں مسلمان مقیم ہوئے سندھ تھا۔ وہاں بھی وہ سمندر سے داخل ہوئے مگر اس دفعہ ان کا مقصد تجارت کی بجائے اپنی مقبوضات کو وسیع کرنا تھا۔ سندھ کی مکمل فتح ۷۱۰ء-۷۱۱ء میں عمل میں آئی اور اس وقت سے نویں صدی عیسوی کے وسط تک وہ اسلامی شہنشاہیت کے سمتِ مشرقی کا ایک صوبہ رہا۔

یہ واقعہ کہ مسلمان سندھ میں قریب چار صدیوں تک نشو و نما حاصل کرتے رہے۔ بعض حضرات کو یہ خیال کرنے کی طرف مائل کرتا رہا کہ وہاں انھوں نے فطرتاً ایک زبان کی نیو ڈالی جو اردو کی ابتدائی شکل تھی۔ مگر یہ خیال بھی انھیں اسباب کی بنا پر قبول نہیں ہے جو پہلے دبستان خیال کی مخالفت میں پیش کئے گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ میں ایک زبان یقیناً ارتقا پاتی رہی۔ مگر وہ اُردو نہ تھی۔ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی۔ جو آج سندھی کہلاتی ہے۔

(۳)

مسلمانوں کی تیسری فتوحات فارسی گو افراد (محمود غزنوی اور اسکے ہمراہیوں) کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔ جنھوں نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اور آخر کار دسویں صدی عیسوی

کے اواخر میں اس پر قابض ہو گئے۔ پنجاب ۱۱۹۳ء تک ایک آزاد حکومت رہا۔ جس کا دار الخلافہ لاہور تھا۔ جب دہلی فتح ہوئی اور محمد غوری کے سپاہیوں نے اس پر قبضہ کیا تو پنجاب دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔

لیکن اس سے پہلے کے دو سو سالوں میں جب کہ پنجاب غزنویوں کا جائے قرار تھا۔ ایک بین قومی زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اسی واقعہ کی بنا پر پنجاب کے بعض جدید ادیبوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اُردو بہ نسبت برج بھاشا کے قدیم پنجابی سے زیادہ مشتق ہے۔ انھیں میں سے ایک پروفیسر حافظ محمود شیرانی اسلامیہ کالج لاہور نے اپنی گرانقدر کتاب "پنجاب میں اردو" میں اردو اور پنجابی دونوں سے متعلق بعض نہایت اہم اور دلچسپ لسانی پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ ان کے اہم لسانی دلائل جن کی بنا پر وہ اردو کو بہ نسبت برج بھاشا کے پنجابی سے زیادہ قریب اور مشترک قرار دیتے ہیں۔ دو قسم کے ہیں۔

پہلی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی اور اُردو دونوں ایک ہی اُصول کے تحت لسانی اور نحوی ارتقا پاتے رہے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس سلسلہ میں کئی دلچسپ مثالیں اور حوالے پیش کئے ہیں۔ ان کی دوسری دلیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو میں چند اجزا ایسے ہیں جن کی توضیح صرف عہد حاضر کی پنجابی ہی کے مطالعہ اور اس پر غور و خوض کرنے سے ہو سکتی ہے۔ نیز یہ کہ چند عناصر ایسے ہیں جن کا حوالہ سوائے پنجابی کے کسی اور زبان میں نہیں۔ مگر یہ خصوصیتیں زیادہ تر لفظی حیثیتوں اور صوتی تغیرات سے متعلق ہیں جو خصوصیتیں راہ راست تعمیر زبان سے تعلق رکھتی ہیں۔ موجودہ اردو میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف قدیم دکنی کارناموں میں نظر آتی ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے۔ نہایت ہی

مفید اور اُردو کی تخلیق و آغاز سے متعلق مفید نتیجوں پر پہنچنے کے لئے کافی مدد معاون ہو سکتا ہے

(۵)

زبان اردو کا آغاز عام مستند رائے کے مطابق اس وقت سے ہوتا ہے جب محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کی سلطنت فتح کی۔ اور اس کے بعد اس حصۂ ملک میں ایک طویل عرصہ تک مسلمان خاندان حکمران رہے۔ متعدد مصنفوں کی یہ رائے ہے کہ اردو دہلی میں فارسی اور ہندی کے میل جول کا ایک فطری نتیجہ ہے۔ نیز یہ کہ وہ عام طور پر محمد تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) کے زمانہ میں بولی جاتی تھی جس کی فوجیں اس زبان کو دکن لے گئیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق ان زبانوں سے ہے جو دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں۔ یہ رائے بھی کلیتاً صحیح نہیں۔ اس میں بہت کچھ ترمیم کی گنجایش ہے۔

اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی جبتک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنا لیا۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم "نئے ہند آریائی دور" میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے

حاشیہ۔ پروفیسر سینتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب "آغاز و ارتقائے زبان بنگالی" کے مقدمہ میں ۱۰۰۰ء کے بعد کے دور کو "نیا ہند آریائی" قرار دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی جدید زبانیں ۱۰۰۰ء کے بعد ہی کی چند پہلی صدیوں میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔

(جلد ۱۔ صفحات ۱۷ تا ۳۰)

اُردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ مگر اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبۂ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی۔ کیوں کہ ہند آریائی دَور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔ ان کی اس وقت کے اختلافات ظاہر کرنے والی بہت کم خصوصیتوں کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔ یہ واقعہ دراصل بارہویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے کہ موجودہ زبانوں نے ان اختلافات کی پرورش شروع کی جو آج انھیں ایک دوسرے سے جدا ظاہر کرتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔ یقین ہے کہ یہ فرق مسلمانوں کے قبضۂ دہلی کے بعد سے شروع ہوا ہے۔ ابتدا میں وہ صرف ایک تدریجی تغیر ہوگا۔ مگر آخر کار ان دونوں مقامات کی بولیوں کے درمیان ایک ایسا خلیج حائل ہوتا گیا کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔ اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے۔ بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں۔ اس لئے اُردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔

یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ اُردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف اس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اسی علاقہ کے رہنے والے

بہیرہ بنگاہ کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آکر آباد ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح و مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آرہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہوتا گیا۔

ہمارے اس نظریہ کا مزید ثبوت اردو کی دکنی شاخ پر غور و خوض کرنے سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ جب شمال کے مسلمانوں نے دکن پر حملہ کیا تو وہاں ان کے ساتھ وہی زبان گئی جو ابھی خام تھی اور جس پر نواح دہلی کی زبان کا پورا اثر نہیں پڑنے پایا تھا۔ یہ غیر پختہ زبان دکن میں پھیل گئی۔ اور بالکل نئے اصول پر نشو و نما پانے لگی۔ وہ ان اثرات سے محروم رہی جو شمال میں اردو کی تشکیل کر رہے تھے۔ اور جن کی وجہ سے وہاں اردو رفتہ رفتہ کھڑی بولی سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

ہندوستانی کا ارتقا

سہ مرکزی تقسیم، اختلاف کے اسباب

زبان ہندوستانی کا ارتقا پنجاب ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اسکے ثانوی مدارج دوآبہ گجرات اور دکن میں تکمیل کو پہنچے۔ دہلی میں یہ زبان ڈیڑھ سو سال تک رہنے کے بعد گجرات اور دکن کا رُخ کرتی ہے۔ اس عرصہ میں ہریانوی اور ایک حد تک برج بھاشا اور اس کی عام بول چال کی شکل کھڑی بولی کے اثرات اس پر کارگر ہو چکے تھے مگر وہ موخرالذکر سے پوری طرح متاثر نہ ہونے پائی تھی۔ گجرات اور دکن میں جب یہ پھیلنے لگی تو شمال اور دکن و گجرات سیاسی اسباب کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے اور ان کی اس سیاسی جدائی نے ہندوستانی زبان کو خاص طور پر متاثر کیا۔ یعنی ہندوستانی تین جدا جدا شاخوں میں بٹ گئی۔ اور یہ تینوں شاخیں صدیوں تک نہ صرف آزاد اور علیحدہ رہیں بلکہ انھوں نے مختلف ارتقا حاصل کئے۔

جب دکنی شاخ کھڑی کے اثر سے بچ رہی تھی۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ شمالی سے جدا ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بہت سی وہ خصوصیتیں محفوظ رکھیں جو آج پنجابی سے مشابہ ہیں۔ یہی در اصل وہ راز ہے جو شمال اور جنوب کی اُردو میں آج تک اختلاف کا باعث ہے۔

اس اہم لسانی سبب کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہندوستانی

تین مختلف مقامات پر تین جدا جدا ارتقا حاصل کرتی ہے۔ ہم پہلے دکن کے جدا ارتقا کے اسباب یہاں بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ وہی سب سے اہم ادبی مرکز ہے اور وہیں کی ادبی پیداوار نے شمال میں بھی ہندوستانی کے لئے ادبی زبان بننے کے اسباب مہیا کئے۔ اس کے علاوہ دکن میں جن اسباب کی بنا پر ہندوستانی زبان تحریر کیلئے مستعمل ہونے لگی۔ تقریباً اسی نوعیت کے اسباب گجرات کی ہندوستانی کے متعلق بھی ہیں۔ دکن میں ہندوستانی اس لئے جلد ارتقا پا گئی اور تصنیف و تالیف کے لئے مستعمل ہونے لگی کہ:-

۱۔ جو لوگ سلطان علاؤالدین خلجی اور اس کے مشہور سپہ سالار ملک کافور کے ہمراہ ۱۳۱۴ء میں اور خاص کر محمد تغلق کے ساتھ ۱۳۲۸ء میں دکن پہنچے۔ ان کی زبان جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے بالکل ابتدائی اور غیر معین اور اثر پذیر حالت میں تھی۔ چنانچہ یہی غیر معین اردو دکن کے ان مسلمانوں میں اشاعت پائی جو یا تو وہیں کے اصلی باشندے تھے یا ایرانی اور عربی مہاجرین کی اولاد سے تھے۔ مگر جب بہمنی سلطنت کے قیام ۱۳۴۷ء کے بعد دکن اور شمال سیاسی حیثیت سے ایکدوسرے سے جدا ہو گئے۔ تو ان دونوں مقامات کی زبان کے اتحاد کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ اس میں ان جگھوں کے غیر مسلم ہمسایوں نے بھی کافی حصہ لیا ہے۔ شمال (یا دوآبہ گنگ و جمن جو ہندو مسلم اتصال کا سب سے بڑا مرکز ہے) میں ہندوؤں کی صرف ایک ہی بولی تھی۔ مگر دکن میں مختلف زبانیں مستعمل تھیں۔ جن میں کوئی آریائی تھی تو کوئی ڈراوڈی۔

پس اردو جہاں شمال میں ایک خاص زبان سے مالامال ہو رہی تھی۔ دکن میں اپنی

ہمسایہ زبانوں میں کسی طرح سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ شمال کی زبان ماخذ کے لحاظ سے اُردو کے قریب تھی۔ اس کے برخلاف دکن کی زبانیں ایک تو متعدد تھیں اور دوسرے لسانی حیثیت سے آپس میں مختلف اور اردو سے بہت دور تھیں۔

۲- فارسی اور ترکی بولنے والے ممالک سے دکن بہت دور تھا۔ اس کے علاوہ ان کوئی سیاسی تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف شمال پر ہمیشہ ان اجنبیوں کے حملے ہوتے رہے۔ قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء) سے بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) تک قریب قریب ہر حکمران خاندان غیر ملکی تھا۔ ان کی زبان رعایا کی زبان سے مختلف تھی۔

دکن کی سلطنتوں کے بانی، شمالی حکمران سلسلوں کے بانیوں کی طرح نو وارد ترکی یا ایرانی نہیں تھے۔ دہلی میں قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک جتنے شاہی خاندان گزرے، سب یکے بعد دیگرے ان شمال مغرب حملہ آوروں میں سے تھے جنکی زبانیں ہندوستان کے لئے اجنبی تھیں۔ دکنی سلطنتوں کے بانی وہی تھے۔ جو دکن یا ہندوستان میں ایک مدت سے مقیم تھے۔ اور ہندوستانی زبان و طرز معاشرت سے مانوس تھے۔ دکن کی پہلی سلطنت بہمنیہ کے بانی حسن کی نسبت تو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ایک برہمن کا غلام تھا۔ اس کا ہندوستانی نہ جاننا اسی طرح تعجب خیز ہے جس طرح تیمور کا ہندوستانی سے واقف ہونا۔

بہمنیہ کے زوال کے بعد جب دکن میں جدا جدا حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے بانی بھی اکثر وہی تھے جو بہمنیہ دربار میں بچپن سے پرورش پا چکے تھے۔ اور جن کا ہندستانی سے ناواقف رہنا محال تھا۔ سلطنت احمد نگر کا بانی تو خود ایک نو مسلم تھا۔ قدیم فارسی

تاریخیں شاہد ہیں کہ وہ کنڑی اور ہندوی (یعنی اس عہد کی اُردو) کا اچھا ماہر تھا۔ عادل شاہی خاندان کی پہلی ملکہ ایک طاقتور مرہٹہ امیر مکٹ راؤ کی لڑکی تھی۔ اس کے بطن سے یوسف عادل شاہ کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا اسمٰعیل عادل شاہ تھا۔ جو باپ کے بعد بادشاہ ہوا۔ اور جس کی اولاد نے آخر تک بیجاپور پر بادشاہت کی۔ تینوں لڑکیوں میں سے ہر ایک کسی نہ کسی دکنی بادشاہ سے بیاہی گئی۔ مثلاً مریم سلطان، برہان نظام شاہ والئی احمد نگر سے۔ خدیجہ سلطان علاؤالدین عماد شاہ والئی برار سے۔ اور بی بی ستی سلطان محمود شاہ بھمنی کے لڑکے سے بیاہی گئی۔

مکٹ راؤ کی لڑکی پوجی خانم کے علاوہ عادل شاہی خاندان میں اور بھی ہندو رانیاں جنوبی ہند وریاستوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ ان میں رنبھارانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے محمد عادل شاہ جیسے جلیل القدر حکمراں کا دل موہ لیا تھا۔ اور جس کی خاطر بادشاہ نے اپنے مشہور و معروف آثار محل میں جو نقش و نگار تیار کرائے تھے وہ آج تک بیجاپوری ذوق فنون لطیفہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔

۲۔ حکمران سلسلوں کے بانیوں کے علاوہ شمال کے بالعموم تمام بادشاہوں کی زبان فارسی یا اور کوئی بیرونی زبان تھی۔ محمد تغلق سے محمد شاہ تک دہلی کے کسی بادشاہ نے ہندوستانی میں نہ نثر لکھی نہ نظم۔ اس کے خلاف دکن میں کئی بادشاہ مثلاً قطب شاہیوں میں محمد قلی، محمد عبداللہ اور ابوالحسن اور عادل شاہیوں میں ابراہیم ثانی، علی ثانی اور سکندر ایسے گذرے ہیں جن میں سے اکثروں کی ہندوستانی نظم و نثر اس وقت بھی موجود ہے۔

بادشاہوں کے علاوہ شمالی سلطنت کے امرا اور علما و فضلا نے بھی ہندوستانی

زبان کے ارتقا میں بہت کم حصہ لیا۔ ان پر ہمیشہ فارسی اثر غالب رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کبھی ترکستان، ایران یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا۔ یا تباہی آتی تو وہاں کے باشندے پناہ لینے کے لئے یا تلاش معاش کی خاطر ہندوستان ہی کا رُخ کرتے چنانچہ آئے دن ان کی ٹکڑیاں ہندوستان میں داخل ہوتی رہتی تھیں اور چونکہ دہلی کے امیروں اور قدردانوں کے دسترخوانوں کی وسعت میں اس وقت تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے سب کے سب وہیں جم جاتے اور چونکہ یہاں رہنے والے ان نوواردوں کے مقابلہ میں بالخصوص جہاں تک زبان ومحاورہ کا تعلق ہے۔ اپنے تئیں کم درجہ سمجھتے تھے اسلئے ان کا یہ احساس پستی (INFERIORITY COMPLEX) نوواردوں کے لئے سرکار و دربار میں بڑے بڑے رتبے حاصل کر لینے کا موقع پیدا کر دیتا۔ اس طرح دہلی کے درباروں نے ہندوستانی کے ارتقا پر کوئی صحتمند اثر نہیں کیا۔

۴۔ شمال مغرب کی جانب سے اکثر حملے بھی ہوا کرتے تھے جن کا سلسلہ احمد شاہ دُرّانی کے پانچویں حملے (۱۷۶۱ء) تک برابر جاری رہا۔ یہ تمام حملہ آور غیر زبانیں بولتے تھے۔ السنہ کی سیاسی مداخلتوں کے سوا علمی و ادبی فضا میں بھی ہر وقت ایرانی اثر غالب رہتا تھا۔ شاہی درباروں سے محمد شاہ کے زمانہ تک بالعموم ٹھیٹ ایرانی شاعر اور عالم گراں بہا صلے حاصل کرتے رہتے تھے۔ پردیسی شعرا کی قدر و منزلت میر و سودا کے زمانہ تک جاری تھی۔ فارسی گو امیروں اور عالموں کی اس آئے دن کی درآمد و اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں فارسی دانی عام اور لازمی ہو گئی۔ اگر کبھی مہلت پاکر فارسیت کا پیدا کیا ہوا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر فارسی زبان بولنے والوں کا ایک ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سر نو ہرا ہو جاتا۔ اس طرح سے شمال کی ہندوستانی میں ایک مستقل علمی اور ادبی زبان

کی حیثیت سے کوئی ترقی نہ ہوسکی۔ البتہ فارسی اور ترکی الفاظ اس میں داخل ہوتے گئے۔

دکن، فارسی گو ممالک سے نسبتًا دور تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں ایرانی نہیں گئے۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ وہاں بادشاہ اور امرا بھی ہندوستانی زبان استعمال کرتے ہیں تو انھوں نے بھی اس کے استعمال کو اپنے لئے باعث ننگ وعار نہیں سمجھا۔ اس کے علاوہ نادرنسخے ثابت کرتی ہیں کہ دکن کے علما زیادہ تر دیسی ہی ہوتے تھے۔ جو دیسی نہ ہوتے وہ دیسیوں کی تفہیم کی خاطر دیسی زبان ہی میں لکھنے کی کوشش کرتے اسکی واضح مثالیں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ اور میراں جی شمس العشاق کی بزرگ ہستیوں کے علاوہ عبدل، مصنف ابراہیم نامہ کی شخصیت بھی ہے جو دراصل دہلی کا رہنے والا تھا اور اردو شعروسخن کی قدر ومنزلت کی شہرت سن کر بیجاپور پہنچ گیا تھا۔

شمال میں ہندو اور مسلمان جہاں درباروں اور مجلسوں میں فارسی گوئی پر مجبور تھے۔ بازاروں اور عام مقامات پر ہندوستانی ہی بولتے تھے۔ جس کی وجہ سے روزمرہ کی زبان میں ارتقا ہوتا گیا۔ دکن میں اس قسم کے ارتقا کے لئے رکاوٹیں تھیں۔ کیونکہ ہندوستانی باوجود کئی صدیوں کی علمی سرپرستی کے دکنی ہندوؤں کی مقامی بولیوں سے مختلف تھی۔ وہ اپنی دیسی بولیوں کو اس میں یا اس کو اپنی بولیوں میں ضم نہ کرسکے جیسا کہ شمال کے ہندوؤں نے کیا۔

مغلیہ سلطنت کے آخری زمانہ میں شمال میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبانیں (یعنی کھڑی اور اُردو) مرور ایام کے ساتھ گھل مل کر ایک ہوگئی تھیں لیکن جہاں دوآبہ کے ہندوؤں نے ایک طرف مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان کو بالکل اپنا لیا۔ دوسری طرف اپنی ادبی زبان برج بھاشا کو ترک کرکے فارسی میں تصنیف

وتالیف شروع کی۔ چنانچہ ان کی اس فارسی تحصیل نے ان کی روزمرہ کی زبان کو بہت متاثر کیا۔ اس کے برخلاف دکنی ہنود اگر فارسی تصنیف وتالیف کرنا چاہتے تو انھیں اُردو کے علاوہ ایک اور اجنبی زبان بھی سیکھنی پڑتی۔ خود اُردو، یا ہندوستانی ان کے لئے ایک بیرونی یا اجنبی زبان تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دکنی ہندوستانی کے لفظی خزانہ میں بیرونی یا فارسی عناصر کا اضافہ نہ ہو سکا جو کچھ بیرونی عنصر ابتدا اسے جزوِ زبان ہو گیا تھا۔ وہی باقی رہا اور اس میں شکلوں کے لحاظ سے بہت کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ جس کا ذکر آئندہ فصل میں کیا جائے گا۔

اس وقت تک جو امور ہندوستانی کی ان دونوں اہم شاخوں کے باہمی اختلاف کی نسبت پیش کئے گئے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں کہ شمالی ہندوستانی پر کھڑی کا ایسا گہرا اثر مرتسم ہوا کہ اس کی بہت سی ابتدائی یا اصلی خصوصیتیں مفقود ہو گئیں اور جو کچھ باقی رہیں وہ مسخ شدہ حالت میں ہیں۔ اس کے برخلاف دکنی میں قدیم سے قدیم شکلیں اور خصوصیتیں بالکل محفوظ رہیں۔ جن کی بنا پر وہ جدید پنجابی کے بہت کچھ مشابہ ہے شمال کی زبان پر فارسی اثر چھا گیا۔ لیکن دکنی اس سے محفوظ رہی۔ ڈراوڈی زبانوں کا اس پر کچھ اثر پڑا۔ اور وہ بھی محدود ہے صرف بول چال کے لفظی خزانہ تک۔ البتہ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ حکمیاتی یا سائنٹفک طور پر دکن اور شمال کے اُردو بولنے والوں کے اعضائے مخارج کا تجزیہ کیا جائے گا۔ ان کی گفتگو اور لب ولہجہ عمل صوتیاتی گردونہ پر قلمبند کر لیا جائے گا اور ٹھیک ٹھیک طریقہ سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ دکن کے ہندوستانی بولنے والوں کا تلفظ یہاں کے ڈراویڈی زبانیں بولنے والوں کے تلفظ سے کس قدر قریب ہے اور شمال کے ہندوستانی بولنے والوں سے کتنا بعید۔

اس قسم کی تحقیقات اضلاع اور دیہات کے باشندوں اور شہروں میں بسنے والوں کی زبان کے درمیان بھی کافی فرق پیش کریں گی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر معیاری دکنی کی خصوصیات معلوم کرنی ہوں تو وہ دیہاتیوں ہی کی اُردو میں ملیں گی۔ کیوں کہ وہ قدیم اردو کی محفوظ ترین شکل ہے۔ تعلیم یافتہ اصحاب یا شہروں کے باشندے عہد حاضر میں شمال کی ہندوستانی سے بہت متاثر ہو گئے ہیں۔

اَدبی بولیاں
گجراتی، دکنی، شمالی

اگر کوئی زبان قسم قسم کی آب وہوار کھنے والے دور دراز ممالک میں بولی جاتی ہو یا اس کے بولنے والے جدا جدا حکومت وریاست کی رعایا ہوں تو اس زبان کا ایک سے زیادہ بولیوں پر منقسم ہو جانا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان ممالک یا حکومتوں کے آپس میں جغرافیائی یا سیاسی ومعاشرتی حیثیت سے جتنا اختلاف ہوگا۔ اسی تناسب سے ان کے باشندوں کی ذہنیت اور زبان میں بھی فرق ہوگا۔ چنانچہ اس کلیہ سے ہماری ہندوستانی یا اردو زبان محروم نہیں ہے۔ ہندوستان جیسے براعظم میں وہ نہایت دور دراز علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے اور ہر علاقہ میں صوتی اور لسانیاتی نظر سے جداگانہ خصوصیتوں کی مالک ہے۔

پشاور کی ہندوستانی کا لب ولہجہ اور لفظی خزانہ مدراس کی ہندوستانی سے بالکل جدا ہے یہی حال کلکتہ کی اُردو بمبئی کی اُردو کا ہے۔ گجرات اور دکن کی بولیاں دہلی اور لکھنؤ کی بولیوں سے کافی اختلاف رکھتی ہیں۔ خود دہلی اور لکھنؤ جو مقابلتہً ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں۔ لب ولہجہ روزمرہ اور محاوروں میں ایسی مغائرت رکھتے ہیں کہ آج تک ان کے مختلف فیہ مسائل تصفیہ نہ پاسکے۔

لیکن ہندوستانی کی متعدد علاقوں کی جدا جدا بولیوں کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی

ادبی بولیاں

کسی زبان کی مختلف شاخیں اسی وقت اہم سمجھی جاتی ہیں جب وہ تحریر کے لئے مستعمل ہو جائیں اس معیار کے لحاظ سے ہندوستانی کی صرف تین شاخیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ گجراتی۔ ۲۔ دکنی۔ ۳۔ دوآبہ کی اردو۔

گجرات بھی دکن کی طرح تغلقوں کے عہد حکومت میں دہلی کی اطاعت سے آزاد ہو گیا تھا اور وہاں بھی ایک آزاد حکومت کے ساتھ ساتھ اردو زبان ترقی کرنے لگی تھی جس میں تصنیفات بھی کی گئیں۔

گجرات میں اردو کا اس قدر جلد ترقی پاجانا کئی اسباب کی بنا پر تھا (۱) دکن کی طرح یہاں بھی فارسی کا اثر دوآبہ کے مقابلہ میں بہت کم پھیلنے پایا۔ (۲) اس کے علاوہ اگر گجرات کے اہل قلم فارسی کے علاوہ کسی اور زبان میں لکھنا چاہتے تو وہاں کوئی دیسی زبان ایسی نہ تھی جس میں وہ لکھ سکتے۔ گجراتی خود اس زمانہ میں ایک ادبی زبان نہیں تھی۔ ہندوستانی ہی ایک ایسی دیسی بولی تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں مشترک تھی اور جب مسلمان صوفی اور بزرگ اپنے خیالات کی تلقین اور تبلیغ کرنا چاہتے۔ تو انھیں لازماً اسی زبان کو استعمال کرنا پڑتا۔

گجرات کی ہندوستانی جس کو جلد ادبی حیثیت حاصل ہو گئی ایک حد تک راجستانی خاندان السنہ سے متاثر ہوئی تھی۔ جس کا ثبوت ان خصوصیات میں ملے گا جو دکنی اور گجراتی کے اختلاف ظاہر کرنے کے لئے ابھی پیش کی جائیں گی۔

اس زبان کے ادبی نمونے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اُن پر اس وقت تک علمی تحقیقات نہیں کی گئی ہیں۔ ایک کتاب "خوب ترنگ" (۱۵۷۸ء) مولفہ میاں خوب محمد چشتی کا راقم نے اپنے پیرس کے زمانہ میں لسانیاتی تجزیہ کیا تھا۔ اس کے نتائج کی پہلی قسط پیرس کی مشہور لسانیاتی مجلس (Society Linguistique) کے جریدہ میں شائع

ہو رہی ہے۔ یہاں صرف اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ گجراتی اردو جس طرح دوآبہ کی زبان سے مختلف ہے۔ دکنی سے بھی ایک حد تک جدا ہے۔ چونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دکنی اور گجراتی ہندوستانی ایک ہی ہے اس لئے یہاں اس کے متعلق صرف چند صوتی اختلافات پیش نظر کئے جاتے ہیں۔ گجراتی اور دکنی کے لسانی، صرفی اور نحوی اختلافوں کی تفصیلی بحث ہمارے اس مقالہ میں شامل رہے گی جو مستقبل قریب میں شائع کیا جا رہا ہے

دکنی اور گجراتی کے اختلافات

۱۔ قدیم ہند آریائی زبانوں میں حروف جر کا استعمال بہت کم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ خصوصیت گجراتی ہندوستانی میں بہت نمایاں ہے۔ اگرچہ دکن میں بھی کبھی کبھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اس عمومیت کے ساتھ نہیں۔ مثلاً خوب محمد کہتے ہیں:-

۱۔ لیلیٰ منھ بات (لیلیٰ کے منھ میں بات)

۲۔ ان بولوں شروع کیا (ان الفاظ سے شروع کیا)

۳۔ کس کام نہ ہووے (کسی سے کام نہ ہووے)

۴۔ ہر بھاتیں کھیا (ہر طرح سے کہا)

۵۔ دل پچھیں (دل کے پیچھے)

۶۔ اس آگھیں (اس کے آگے)

۷۔ جس صفات (جس کی صفات)

۸۔ اس تفصیل (اس کی تفصیل)۔

۹۔ جس مداح (جس کا مداح)

۱۰۔ جنہ خالق (جن کو خالق)

۲۔ جو حروف جو گجراتی ہندوستانی میں مستعمل تھے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو دکنی میں نظر نہیں آتے۔ یعنی مانہ، منھ، مانہی، ہیں وغیرہ مثلاً ۱۔ گنتی مانہ / ۲۔ قید وں مانہ۔ ۳۔ جگ منھ، ۴۔ مُنھ منھ، ۵۔ جتے (جتنہ) مانہی، ۶۔ برس ہیں، ۷۔ محل ہیں۔ دکنی میں ایسے موقعوں پر منے یا میں استعمال ہوتا تھا۔ واضح ہو کہ یہ موخر الذکر حروف جو گجراتی میں بھی متذکرہ بالا کے علاوہ موجود تھے۔

۳۔ گجراتی میں سوں، تھیں، تھے کے علاوہ ایک شکل "سوے" بھی رائج تھی جو دکنی میں اب تک نظر سے نہیں گزری۔ مثلاً پہلوں سوے (پہلے سے) نہایت سوے (کثرت سے)

۴۔ گجراتی ہندوستانی میں عام لفظوں اور خاص کر افعال کے آخری حروف علت انفی ہو جاتے ہیں مثلاً :۔

گجراتی	دکنی	گجراتی	دکنی
میرا کہناں	میرا کہنا	ہلنیں جلنیں باج	ہلنے جلنے باج
دیکھنا دیوے	دیکھنے دیوے	منیں	منے
چلنیں	چھلنی	خوبیں	خوبی

۵۔ بعض الفاظ کا ارتقا دکنی اور شمالی ہندوستانی میں ایک طرح پر ہوا اور گجراتی میں دوسری طرح پر مثلاً :۔

دکنی اور شمالی	گجراتی	دکنی اور شمالی	گجراتی
کتا	کوتا	تھکنا	تھاکنا
کل	کال	گھٹنا	گھاٹنا
کھڈا	کاڈا	پھر	پھیر

۶۔ بعض الفاظ کے تلفظ کے متعلق بھی گجراتی تحریروں میں عجیب مواد حاصل ہوتا ہے

۱۔ سوے (سب)	۲۔ داؤں (دامن)
۳۔ دوہوں (دونوں)	۴۔ چھاں (چھاؤں)
۵۔ برویا (بھرپیا)	۶۔ کھونا (کونا)
۷۔ آدو (آدھا)	۸۔ کُلف (قفل)
۹۔ بلیت (پلید)	۱۰۔ الگی (الگ)

گجرات میں ہندوستانی زیادہ عرصہ تک نشو ونما نہیں حاصل کر سکی کیونکہ اکبر کے زمانہ میں ۱۵۷۲ء میں یہ سلطنت ختم ہو گئی جب یہ علاقہ مغلیہ صوبہ بن گیا۔ اور ہندوستانی کے قدردان باقی نہ رہے تو یہاں کے اکثر شاعر اور اربابِ علم وفضل دکن اور خاصکر بیجاپور چلے گئے۔ چنانچہ اسی وقت سے گجراتی ہندوستانی کی اہمیت بھی باقی نہیں رہی

اس سلسلہ میں یہ واقعہ ضرور قابل ذکر ہے کہ گجرات کی سلطنت کا ختم ہونا دکنی ہندوستانی کی ترقی اور نشو ونما کے لئے مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ زوال سلطنت کے ساتھ ہی وہاں کا علمی وادبی شیرازہ بکھر گیا۔ شاعر اور ادیب بے سروسامانی کے حالت میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے لگے۔ ایسے نازک موقع پر دکن کی ایک سلطنت بیجاپور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فیاضی اور علیسی نفسی دکھائی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بیش بہا تحائف اور سوغات دے کر گجرات روانہ کیا۔ تاکہ وہاں کے علما اور شعرا کو بیجاپور کے دربار میں آنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد گجرات کی ادبی عظمت کا پرچم بیجاپور پر لہرانے لگا۔ مشہور ومعروف ہستیوں کے علاوہ اکثر عام لوگ بھی بیجاپور آ گئے تھے۔ اور ان گجراتیوں کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ بعض دکنی مصنف

بھی اپنی گجراتی آمیز ہندوستانی کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے۔

دکنی ہندوستانی کے ارتقا کی بحث میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی ہی کے عہد میں گجرات کے علاوہ دوآبہ کے بھی ارباب علم و فضل دکن پہونچے[1]۔ کیونکہ اس بادشاہ کو موسیقی اور ہندوؤں کے علوم سے دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں ان علوم و فنون کے جو ماہر ہندوستان خاص سے آئے تھے وہ یا تو برج بھاشا کے شاعر اور موسیقی دان تھے۔ یا ان کی زبان پر برج بھاشا کا بہت اثر تھا۔ چنانچہ خود ابراہیم نے برج بھاشا سیکھی اور اس کی کتاب "نورس" اسی زبان میں ہے۔ بادشاہ کے اس شغف کا اثر عالموں اور شاعروں پر بھی پڑا اور ان کی زبان جہاں گجراتی سے متاثر ہو رہی تھی برج بھاشا کے اثرات بھی قبول کرنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور سے دکنی شاعروں کے کلام میں برج بھاشا کے ایسے ایسے الفاظ اور ترکیبیں مستعمل ہونے لگیں کہ سرسری نظر ڈالنے والا بمشکل کہہ سکے گا کہ دکنی اردو کئی سو سال تک برج کے اثر سے محفوظ رہ چکی ہے۔

لیکن برج بھاشا کے اس خارجی اثر کے باوجود شمال اور دکن کی ہندوستانی بولیوں میں متعدد اصولی اختلاف ہیں۔ جہاں ہم نے گجراتی اور دکنی کے آپس کے اختلاف کے کچھ نمونے پیش کئے ہیں ضروری ہے دکنی اور شمالی کے فرق بھی ظاہر کر دئے جائیں۔ گجراتی کے بعد صرف دکنی ہی ہندوستانی کی ایک ایسی ادبی بولی تھی

[1] ابھی چند ماہ پیشتر بیجاپور کے ایک اور شاعر کا کلام دستیاب ہوا ہے جو دوآبہ کا رہنے والا تھا اور ابراہیم عادل شاہ کی زبان ہندوستانی کی سرپرستی کا شہرہ سن کر دکن آیا تھا اس کا تخلص جدل ہے اور اسکی کتاب ابراہیم نامہ رسالہ ہندوستانی بابتہ ماہ   ۳۲ء میں ایک مضمون شائع ہو چکا ہے۔

جس میں سوا سو سال تک ادب پیدا ہوتا رہا۔ دکن کا ادب گجرات سے زیادہ عالیشان ہے اور اسی کی وجہ سے "ہندوستانی" شمال میں بھی ادبی زبان بنتی ہے[۱]۔

دکن اور شمال کی بولیوں کے فرق "ہندوستانی صوتیات" میں تفصیل سے مرقوم ہیں[۲]۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر صرف چند امور کا ذکر کریں گے :-

تلفظ کے اختلافات

(۱) حروف علت۔ دکنی ہندوستانی میں ایک خاص حرف علت ایسا ہے جو شمالی میں نہیں پایا جاتا[۳]۔ اس حرفِ علت کا تلفظ نہ تو معمولی پیش کی طرح ہے اور نہ واؤ معروف کی طرح۔ اس کا مخرج ان دونوں کے درمیان ہے۔ یہ آواز ذرا اوڈی ہے اور اکثر انھیں لفظوں میں پائی جاتی ہے جو اسی خاندان کی زبانوں سے اردو میں داخل ہو گئے ہیں مثلاً پٹّا (چھوکرا)، ڈبا (موٹا)، بُرّا (توندا) ٹُوپا (ٹوپی) وغیرہ۔

(۲) اگر کسی لفظ میں دو لمبے حروفِ علّت ہوں تو دکنی ہندوستانی میں پہلے کا تلفظ چھوٹے حرفِ علّت کی طرح کیا جاتا ہے۔ مثلاً :-

شمالی	دکنی
آدمی	ادمی
آسمان	اسمان
بھیگنا	بھگنا
سُونگھنا	سُنگھنا

۱؎ اس موضوع پر آئندہ تفصیل سے بحث کی جائے گی ۲؎ دیکھو "ہندوستانی صوتیات" صفحات (۲۶ تا ۲۷)

۳؎ ڈاکٹر سکسینہ پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی نے "زبان اودھی" میں بھی اس کے وجود کی توضیح کی ہے۔

واضح ہو کہ آخری دو مثالیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ دکنی نے ان لفظوں کا اصلی پراکرتی تلفظ ہی آج تک محفوظ رکھا ہے۔

حروف صحیح۔ ۱۔ عربی حرف "قاف" کا تلفظ ہندوستان کے لئے اجنبی ہے اس لئے دوآبہ کے اردو بولنے والوں کے علاوہ دوسرے مقامات کے اردو داں اس کا صحیح تلفظ نہیں کرتے۔ پنجاب میں یہ "ک" کی طرح بولا جاتا ہے اور دکن میں "خ" کی طرح

۲۔ پراکرت میں جن لفظوں میں ابتدائی آواز دندانی تھی اور لفظ کے درمیان میں کوزی تو ایسے لفظ کا ارتقا دوآبہ کی اور دکن کی بولیوں میں جدا جدا طریقہ پر ہوا۔ دوآبہ میں ابتدائی دندانی آواز بھی کوزی بن گئی۔ اس کے برخلاف دکن میں اصلی تلفظ باقی رہا۔ مثلاً

	دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ
دندانی۔	تکڑا	ٹکڑا۔ کوزی	تاٹ	ٹاٹ
	تھڑنا	ٹھڑنا	تھنڈ	ٹھنڈ
	دیڑھ	ڈیڑھ		

۳۔ دکنی زبان میں ایک اور قدیم خصوصیت محفوظ رہی۔ پراکرت میں جن الفاظ کے درمیان میں دوہرے حروف صحیح تھے۔ برج بھاشا اور کھڑی میں اکہرے ہو گئے۔ اس طرح سے جب ایک حرف صحیح کم ہو گیا تو لفظ کا وزن قائم رکھنے کے لئے حرف علت بنا دیا گیا دوآبہ کی اردو میں بھی خصوصیت پیدا ہو گئی۔ اس کے برخلاف دکن میں اکثر الفاظ اصلی حالت میں قائم رہے۔ مثلاً:۔

دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ
چنّا	چونا	پھکّا	پھیکا	ہتھّی	ہاتھی

اس قسم کے لفظوں کے علاوہ دکنی زبان میں بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کے درمیان میں دوہرے حروف صحیح ہیں حالانکہ وہی الفاظ شمال میں ایک ہی حرف صحیح سے ملفوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً:-

دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ
نمّک	نمک	ڈلّی	ڈلی
جوّا	جوا	تلّا	تلا

۴۔ ان دونوں بولیوں میں نفسی حروف صحیح کے تلفظ میں بھی متمائز فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً:-

ا۔ درمیانی حرف "دھ" دکن میں "د" ملفوظ ہوتا ہے۔

دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ
سمدی	سمدھی	باندنا	باندھنا
کدر	کدھر	سادو	سادھو

ب۔ اسی طرح حرف "ڑھ" "ڑ" ملفوظ ہوتا ہے۔ مثلاً:-

دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ
گڑا	گڑھا	چڑاؤ	چڑھاؤ

ج۔ غیر نفسی درمیانی "ٹ" دکن میں "ٹھ" ملفوظ ہوتی ہے۔ مثلاً:-

دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ	دکن	دوآبہ
لٹھو	لٹو	اُلٹھا	اُلٹا	پلٹھانا	پلٹانا

اسی طرح کے اور کئی صوتی اختلافات ہیں مگر یہاں نمونہ کے طور پر صرف چند پیش کر دئے گئے ہیں اب لسانی اور صرفی ونحوی اختلافات میں سے بھی چند مثالیں قلمبند کی جاتی ہیں ان کی تفصیل

ہندوستانی صوتیات کے صفحات (۳۷ تا ۴۴) میں مندرج ہے۔

۱۔ دکن کے بیسیوں الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو شمال میں مستعمل ہوناتو کجا شاید سمجھے بھی نہیں جاتے۔ اسی طرح شمال کے خاص خاص الفاظ دکنی کیلئے اجنبی ہیں۔ یہ کئی قسم کے ہیں مثلاً:-

(ا) وہ الفاظ جو دکن اور شمال کی اُردو میں وہاں کی مخصوص ہمسایہ یا مقامی زبانوں سے داخل ہوئے ہیں۔

(ب) وہ غیر زبانوں کے الفاظ جو ہندوستانی کی دونوں شاخوں میں ایک ہی شکل سے داخل ہوئے لیکن بعد میں چل کر ان کی شکلیں اور ترکیبیں بدل گئیں۔

(ج) ایسے الفاظ جو اُن میں سے کسی میں اپنی اصلی شکل اور مفہوم کے خلاف رائج ہو گئے ہوں۔

(د) وہ خاص خاص مفرد اور مرکب الفاظ جنھیں محاورہ یا ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے (ان سب قسموں کی مثالیں ہندوستانی صوتیات کے مقدمہ میں مندرج ہیں۔)

۲۔ قواعد زبان کے نقطۂ نظر سے بھی ان دونوں بولیوں میں اہم اختلافات ہیں اگرچہ وہ موجودہ دکنیوں کی زبان میں وہ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے کیونکہ تعلیم کے اثر سے انھیں شمال کی بولی استعمال کرنی پڑ رہی ہے مگر دیہاتیوں کی زبان میں اب بھی وہ اختلافات موجود ہیں ان اختلافات کی مستند ماخذ دراصل دکن کی ادبی کتابیں ہیں جنکی ایک کثیر تعداد اس وقت تک دستیاب ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کی زبان اور شمال کی قریب قریب اُسی زمانہ کی زبان کا مقابلہ کرنے سے جو سب سے بڑا اور امتیازی فرق معلوم ہوتا ہے وہ فعل کی جنس ہے۔ دکن میں فعل فاعل کے لحاظ سے لایا جاتا ہے اور شمال میں مفعول کے لحاظ سے۔ یہ ایسا فرق ہے جس کی وجہ سے عبارتوں میں بہت تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکی مثالیں اس نقشہ سے واضح ہوں گی۔

	فاعل	مفعول	حالتِ فعل — شمال		حالتِ فعل — دکن	
۱	واحد مذکر	واحد مونث	واحد مونث	لڑکے نے روٹی کھائی	واحد مذکر	لڑکا روٹی کھایا
۲	واحد مذکر	جمع مونث	جمع مونث	لڑکے نے روٹیاں کھائیں	واحد مذکر	لڑکا روٹیاں کھایا
۳	جمع مذکر	واحد مونث	واحد مونث	لڑکوں نے روٹی کھائی	جمع مذکر	لڑکے روٹی کھائے
۴	جمع مذکر	جمع مونث	جمع مونث	لڑکوں نے روٹیاں کھائیں	جمع مذکر	لڑکے روٹیاں کھائے
۵	واحد مونث	واحد مذکر	واحد مذکر	لڑکی نے لڈو کھایا	واحد مونث	لڑکی لڈو کھائی
۶	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مذکر	لڑکی نے لڈو کھائے	واحد مونث	لڑکی لڈواں کھائی
۷	جمع مونث	واحد مذکر	واحد مذکر	لڑکیوں نے لڈو کھایا	جمع مونث	لڑکیاں لڈو کھائے
۸	جمع مونث	جمع مذکر	جمع مذکر	لڑکیوں نے لڈو کھائے	جمع مونث	لڑکیاں لڈواں کھائے

فعل کی تذکیر و تانیث کے بعد دکن اور شمال کی ہندوستانی شاخوں میں اسمار کے جمع بنانے کے متعلق بھی اختلافات ہیں۔ مثلاً:-

۱۔ دکن میں مذکر اسم کی جمع بنانے کیلئے الفِ حرف علت "آں" واحد کے آگے بڑھا دیتے ہیں۔ شمال کی زبان میں ایسا نہیں ہوتا۔ واحد اور جمع دونوں کیلئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے

شمال	دکن	شمال	دکن
ڈھول اچھے ہیں	ڈھولاں اچھے ہیں	کئی مرد تھے	کئی مرداں تھے
گناہ بخش دیے	گناہاں بخش دیے	کتنے کاغذ تھے	کتنے کاغذاں تھے

۲۔ دکن میں اسم مونث کی جمع کے لئے بھی "آں" کا اضافہ کیا جاتا ہے اس کے برخلاف شمال میں "ایں" بڑھاتے ہیں مثلاً:-

شمال	دکن	شمال	دکن
کن کی کتابیں ہیں	کن کی کتاباں ہیں	دوائیں لاؤ	دواتاں لاؤ
آنکھیں بند کیں	آنکھاں بند کیا	لاتیں مارتا ہے	لاتاں مارتا ہے

۳۔ دکن میں حرفِ ربط سے پہلے جمع اپنی شکلیں نہیں بدلتی لیکن شمال میں حروفِ مغیرہ کا بڑا اثر پڑتا ہے۔

شمال	دکن	شمال	دکن
ڈھول سے آواز نکلی	ڈھولاں سو آواز نکلی	آدمیوں کو مارا	آدمیاں کو مارا
پھولوں کے ہار	پھولاں کے ہار	کاغذوں کی ڈوکری	کاغذاں کی ڈوکری

اس قسم کے اختلافات بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر وہ اس قدر اہم ہیں کہ ان کی وجہ سے زبان کی شکل اور لب و لہجہ میں کافی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی کی ہمہ گیری

فتح دکن، تحریک مظہر، لکھنؤ کی خدمات

اورنگزیب کی فتح دکن کے بعد شمال اور دکن میں ملاپ ہو جانے کی وجہ سے شمال کے لوگ دکن اور دکن کے شمال آنے جانے لگے۔ اس اختلاط نے ان دونوں میں اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس پیدا کیا۔ چونکہ دکن کے اہل قلم نے اپنے اسلوب میں بہت کچھ ادبی کام کیا تھا۔ شمال کے اہل زبان نے معلوم کیا کہ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اپنی گفتگو کی زبان کی علمی سرپرستی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اب وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ جعفر علی کا اُردو کلام اسی دور اختلاط اور اسی اثر کا نتیجہ تھا۔

مرزا معز موسوی خاں فطرت، اورنگ زیب کے ایک فارسی شاعر ہیں۔ انکا یہ اُردو شعر تذکروں میں ملتا ہے۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے ۔۔۔ در خانۂ آئینہ گھٹا جوم پڑی ہے

مرزا معز کے ساتھ ایک اور شاعر، قزلباش خاں امید کے بھی اُردو شعر ملتے ہیں جن کا ایک نمونہ یہ ہے ؂

باسن کی جیتی آج مری آنکھوں پڑی ۔۔۔ غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی

فارسی عنصر کے نکل جانے کے اسباب

(۱) اس طرح کے فارسی شاعروں میں جنھوں نے دو چار شعر اُردو میں بھی

لکھے ہیں۔ شاہ سعد اللہ گلشن اور عبدالقادر بیدل کے نام بھی گنائے جا سکتے ہیں یہ اور ان کے بعد کے دوسرے فارسی شاعروں نے جب دیکھا کہ دکن میں اردو شعر گوئی کا ذوق ترقی کر چکا ہے اور وہاں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں تو وہ شوق سے دکنی ادب کی طرف بڑھنے لگے اور چونکہ اس اثنا میں فارسی شاعری سے اُکتا گئے تھے ایک غیر ملک کی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے انھیں کافی محنتیں کرنی پڑتی تھیں اور اس کے بعد بھی وہ ایرانی شاعروں کے مقابلہ میں اپنے تئیں کمزور پاتے تھے۔ فارسی اب ان کی اپنی زبان نہ رہی تھی وہ اپنی طرف سے ادائے خیال کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ وہ ایسا کرتے بھی تو اہل زبان معترض رہتے تھے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کی قدر کرنے والی سلطنتیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں حکمرانوں میں اس کا پہلا ذوق باقی نہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ فارسی میں ہندوستانی شاعروں کے خیالات ادا کرنے کے نئے نئے طریقے مسدود تھے، اس لئے جب انھوں نے دکنی ہندوستانی کا مطالعہ کیا جو اُن کے لئے فارسی سے زیادہ قریب تھی اور جس کے ذریعہ سے ان کے فطری رجحانات ظاہر ہو سکتے تھے تو انھوں نے فارسی کو ترک کرنا شروع کیا۔ یہ بیزاری اس حد تک پہنچی کہ جب سودا یا میر جیسا کوئی بڑا شاعر فارسی میں لکھتا تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے رتبہ سے اُتر کر یہ کام کر رہا ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا اور فارسی کے ترک کرنے کا سبب میر نے شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:-

خوگر نہیں کچھ یونہی، ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا، باشندہ دکن کا تھا

اس زمانہ میں دکن کے جو اردو شاعر، شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اُردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جارہے ہیں) اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایک مصحفی ہی کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ اُردو شاعر دہلی گئے تھے۔ جہاں انھوں نے قدرو مقبولیت حاصل کی۔ تذکرۂ اعظم الدولہ سرور سے بھی اس بارے میں اچھا مواد حاصل ہوتا ہے۔

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں شمال کے تیس کے قریب ایسے شاعروں کے نام ملتے ہیں جو دکن گئے تھے۔

یہ تو شاعروں کا حال تھا۔ اس زمانہ میں دکن کی بہت سی اُردو کتابیں بھی شمال پہنچیں چنانچہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں دکن کی معتد بہ اردو قلمی کتابیں جمع ہوگئی تھیں اسپرنگر کا کٹلاگ ان کے تذکروں سے معمور ہے۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ دکن کے اردو ادب نے شمال میں کس قدر مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ اس کی شہادت اس طرح سے بھی ملتی ہے کہ یورپ کے مختلف کتب خانوں میں جو قدیم دکنی مخطوطے محفوظ کرلئے گئے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے کاتب شمالی ہند کے باشندے تھے اور جنھوں نے محمد شاہ کے اوائل عہد میں دکن کی ان اُردو کتابوں کو نقل کیا تھا

قدیم تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی مجلسوں میں دکن کے اُردو اشعار دلچسپی سے سُنے جاتے تھے اور دکنی شاعروں کی آؤبھگت ہوتی تھی۔ ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور پھر بھی جی نہیں بھرا۔ ایک غزل میں لکھتے ہیں:-

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دہلی کے شاعر ولی کی غزلوں کی تقلید میں غزلیں لکھتے اور انھیں کے شعروں سے اپنے مشاعروں کے لئے مصرع طرح حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ اب تک شمال کے اس زمانہ کے اردو شاعروں کے کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوئے ہیں، تاہم دیوان زادہ حاتم سے اس کے ثبوت ملتے ہیں۔ دیوان زادہ اس عہد کی تنہا محفوظ یادگار ہے۔ اس کا نفیس اصلی نسخہ، انڈیا آفس میں موجود ہے۔ چنانچہ راقم نے اس کو مرتب کر لیا ہے اور اب وہ ہندوستانی اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

دیوان زادہ کے دیباچہ میں حاتم نے ولی کی اُستادی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں انھیں کی طرز میں لکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی غزلوں میں ولی کی اُستادی کا ذکر کرتے ہیں ان کے اس مختصر انتخاب کلام میں بھی تیرہ ۱۳ غزلیں ایسی ہیں جن پر صراحت کر دی ہے کہ یہ ولی کی زمین اور تقلید میں لکھی گئی ہیں۔ بعض شعروں میں وہ ولی سے مخاطب بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ولی کی موجودگی ہی میں لکھے گئے ہیں[1]۔

تذکرۂ قاسم میں ولی کی تعریف کرنے کے بعد اس زمانہ کے ایک شاعر کا مصرعہ اپنے خیالات کی شہادت کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے "پیر خاں کمترین کہ خدایش بیامرزد، بسیار بموقعہ و بجا گفتہ کہ

"ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں۔"

---

[1] اس ضمن میں مزید معلومات، میرے اس مضمون میں درج ہیں جو شاہ حاتم پر رسالہ ہندوستانی میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

ہندوستانی کی ہمہ گیری

اس زمانہ کی ایک اور تصنیف "تذکرۂ بے جگر" میں، جس کا خود مصنف کا لکھا ہوا مخطوطہ انڈیا آفس میں موجود ہے، ولی کی نسبت لکھا ہے :-

"در حقیقت کسے کہ اسپ در میان ہندی دوانید آں بود، ولی الواقع شخصے کہ آب رفتہ باز در جوئے ایں زبان ہندی رسانید۔ ہماں بود چوں در سنۂ اثنا جلوس محمد شاہی، دیوانِ او بدہلی رسید، موزوں طبعانِ بلند فکر و عالی تلاشانِ ہم عصر، مثل حاتم و آبرو و فغاں وغیرہ بہ تتبع زبانش پیرو وہم زبان شدند۔"

ایک اور تذکرۂ طبقات سخن میں آبرو کے ذکر میں لکھا ہے کہ :-

"چوں دیوانِ ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بدہلی رسید، تتبع آں شد۔"

مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندوی میں حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے دہلی میں اردو شاعری اور تصنیف و تالیف کے آغاز پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

"روزے پیش نقل مے کرد کہ در سنۂ دوم فردوس آرام گاہ، دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ، واشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ، با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد، بنائے شعر ہندی را بایہام گوئی نہادہ، داد معنی یابی و تلاش مضامین تازہ میدادیم۔"

ولی کے علاوہ، دکن کے جن اردو شاعروں کے کلام نے دہلی میں شہرت

حاصل کی، ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی بھی شامل ہیں۔ میر حسن، اپنے تذکرہ کے آغاز میں یہ لکھنے کے بعد کہ "باید دانست کہ ریختہ اوّل از زبان دکنی است"۔ فقیر اللہ آزاد کا حال لکھتے ہیں اور پھر اُس کی شاعری کی یوں تعریف کرتے ہیں :۔

"ہمراہ فراقی دکنی در شاہجہان آباد آمدہ بود، طبع دردمندے داشت دلبسیار بصفا حرف مے زد۔ خدایش بیامرزد"

غرض ان اسباب اور حالات کے نتیجہ کے طور پر دہلی میں اردو تصنیف وتالیف اور شاعری کا آغاز ہوا۔ ساتھ ہی فارسی کا اثر کم ہونے لگا۔ چونکہ دکن کے اردو کلام کے اثر سے ابتدا ہوئی تھی اس لئے اوّل اوّل دکنی طرز کی پیروی کی گئی۔ اس کے خلاف لکھنے والے کی شاعری غلط سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس آغازی دَور کے ایک مشہور شاعر شاہ مبارک آبرو نے اس کے متعلق جو نصیحت کی تھی اس کو حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے :۔

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے اُنسے کہتا ہوں کہ بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل وحرف لغو ہیں گے فعل، اسکے ریختہ میں حرف ہے

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا اظہار ضروری ہے کہ شمال کی ہندوستانی بولنے والوں نے جب دیکھا کہ دکن سے جو کتابیں آرہی ہیں اس کی زبان ان کی زبان سے مختلف ہے اور اس میں کچھ برج بھاشا کے الفاظ اور اسلوب شامل ہے تو انھوں نے شاید خیال کیا کہ دکن والوں نے برج بھاشا کی تقلید میں شعر وشاعری شروع کی ہے اس لئے خود بھی برج بھاشا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اس کے دوہوں وغیرہ کے طور پر اردو میں بھی کلام کہنا شروع کیا۔ چنانچہ اسی اثر کے تحت صنعت ایہام کا

رواج بڑھنے لگا۔ عہد محمد شاہ کے جملہ شاعروں کے کلام میں اس صنعت کی جو کثرت ہو اس کا اصلی راز یہی ہے۔

لیکن شمال کے ہندوستانی بولنے والوں نے غلط اندازہ کیا۔ اور اسی کی بنا پر غلط اسلوب اختیار کر لیا۔ دکنی ہندوستانی کی تصنیف و تالیف برج بھاشا کی تقلید میں نہیں شروع ہوئی تھی جیسا کہ گذشتہ فصلوں میں ذکر آچکا ہے۔ دکن کا ہندوستانی ادب یہاں کے حالات و واقعات کی فطری پیداوار تھا۔ اہل شمال کا ایسا سمجھنا ایک غلط فہمی نہیں بلکہ وہاں کی روایات اور معتقدات کے موافق تھا۔ کیوں کہ وہاں ہندوستانی کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس میں تصنیف و تالیف کی جا سکے۔ وہاں کی تحریری زبان یا تو فارسی تھی یا برج بھاشا۔

تحریک مظہر

لیکن شمالی ہندوستانی کا یہ اسلوب، عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔ دکنی طرز کی پیروی اہل شمال کے لئے غیر فطری تھی۔ اس میں بھی خیال ادا کرنے کے لئے انھیں تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا تھا۔ اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی روزمرہ کی زبان میں فارسی اجزا کی آمیزش کر کے شعر لکھیں۔ اگرچہ پہلے پہل بعض شعرا نے اس کی مخالفت بھی کی مگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی اور بہت جلد اُردوئے معلی کی زبان میں شعر و شاعری ہونے لگی۔ اس رجحان کا آغاز مرزا مظہر جانجاناں نے کیا اور اس کی ترقی عہد ناسخ تک جاری رہی۔

مرزا مظہر اگر اس وقت یہ تحریک نہ پھیلاتے تو آج اردو زبان غالباً یہ نہ ہوتی، جس میں اس وقت یہ عبارت لکھی جا رہی ہے۔ مظہر کے اس اجتہاد کے متعلق اُسی زمانہ کے ایک اُستاد شاعر شیخ مصحفی اپنے تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں:-

ہندوستانی کی ہمہ گیری

• در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا وغیرہ کے درعرصہ نیامدہ بود ودور دور ایہام گویاں بود اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست ۔۔ ۔ فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا است۔ بعدہٗ نقش بدیگراں رسیدہ۔"

اور جب انھوں نے دیکھا کہ دکنی ہندوستانی کا اسلوب برج بھاشا سے کچھ ملتا جلتا ہے تو انھوں نے اس کو برج بھاشا ہی کی تقلید سمجھ لیا۔ اور اب ان کی زبان کچھ دکنی اور کچھ برج بھاشا سے متاثر ہونے لگی۔

حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر، اپنے دیوان زادہ کے دیباچہ میں کیا ہے اور چونکہ وہ دہلی میں اُردو شاعری کے آغازی اور اصلاحی دونوں رجحانوں کی ترویج و ارتقا کے وقت زندہ تھے اس لئے ان کا بیان اُس بارے میں زیادہ دلچسپ اور مستند ہے وہ کہتے ہیں:-

"دریں ولا، ایں ز بیت طلب از دہ دوازدہ سال، اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و فارسی کہ قریب الفہم وکثیر الاستعمال باشد، روزمرہٗ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیح گویان رند در محاورہ دارند، منظور داشتہ، سوائے آن، زبان ہر دیار تا بہندوی کہ آں را بھاکا گویند، موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بودہ اختیار کردہ۔ وشمہٗ از اں الفاظ کہ تقید دارد بہ بیان مے آرد۔ چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تسبیح را تسبی و صحیح را صحی و بیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ و مانند آں بطور عامہ۔ یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک چنانچہ مرض را مرض و غرض را غرض و مانند آں۔ یا الفاظ ہندوی کہ نین و جگ و نت و بسر وغیرہ آنچہ باشد یا لفظ مار و مراد ازین قبیل کہ بر خود قباحت

لازم آید۔ یا بجائے سے ستی دسیتی۔ یا اُدھر را اُودھر و کدھر را کیدھر کہ
دراں زیادتی حرف باشد یا بجائے پر بہ تیری را تجہ کہ (و لفظ تجہ[1] بعضے
جا مناسب و بعضے جا غیر مناسب چنانچہ تجھے و تجکو بہتر است و تجہ چشم
نے و تجہ نگاہ نے محاورہ نیست بجائے ایں تیری چشم نے و تیری
نگاہ نے می تواں گفت) باختصار آید، یا یہاں را یاں یا وہاں
را واں (و ہر ایک را ہر یک) کہ در مخرج تنگ بود یا کسرہ و فتح
وضم در قافیہ یا قافیہ را، فارسی با ار ہندی، چنانچہ گھوڑا و بورا،
و سرو دھڑ و مانند آں۔ مگر ہائے ہوز را بدل کردن بہ الف کہ از
عام تا خاص در محاورہ دارند بندہ دریں امر بمتابعت جمہور مجبور
است۔ چنانچہ بندہ را بندا و شرمندہ را شرمندا و آنچہ ازیں قبیل
باشد و ایں قاعدہ را تا کجا شرح دہد۔ غرض کہ خلاف محاورہ و غیر
مصطلح و غلطی روزمرہ و نقصان فصاحت را (داخل بناشد العاقل
تکفی الاشارہ و دریں مختصر الفاظ مذکورہ انشاء اللہ تعالیٰ نخواہد بود
مگر در مثنوی تمہ و حقہ کہ عمداً مرقوم نمودہ تا گفتگوئے قدیم نیز) بنظر
موشگافان ایں فن و دور بینان معانی سخن در آید و اتفاقاً اگر در غزلیات باشد
بر خطا صفاد و ح ماکہ رملاحظہ نمودہ از خطا درگذرند و انصاف را از دست
ندہند کہ الانسان مرکب السہو والنسیان واقع است۔ واللہ علی التوفیق
غرض مرزا مظہر کی تحریک کے بعد سے ایک طرف برج بھاشا اور دکنی ہندوستانی کی

---

[1] قوسین میں کی عبارت اصل مخطوطہ میں حاشیہ پر لکھی ہوئی ہیں۔ متن کتاب میں صرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

تقلید موقوف ہوگئی اور بہت سے الفاظ اور محاورے متروک قرار پائے مثلاً نین، جگ بت، ہسرنا، انپڑنا وغیرہ اور دوسری طرف لفظوں کی شکلوں اور املا میں بھی فرق پیدا ہوگیا۔ اس سے پہلے جس طرح بولتے تھے۔ اُسی طرح لکھتے تھے اور یہ نتیجہ تھا عدیوں کے تغیرات اور ارتقائی حالات کا اُس زمانہ میں لفظ تسبیح یا صحیح کا تلفظ تسبی یا صحی کیا جاتا تھا۔ اور آج تک بھی ان لفظوں کا تلفظ یہی ہے مگر اس زمانہ میں انھیں لکھتے بھی اسی تلفظ کے مطابق تھے۔ البتہ آج ہم لکھتے کچھ ہیں اور پڑھتے کچھ ہیں۔

تحریکِ مظہر کے نتائج

پس مظہر کی تحریک کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ الفاظ اصلی عربی یا فارسی املا کے مطابق لکھے جانے لگے۔ اردو زبان میں داخل ہونے کے بعد اُن کے تلفظ یا شکل میں جو کچھ تغیر یا ارتقا ہوا تھا وہ غلط قرار پایا۔ مثلاً تسبی، صحی، بگانہ اور دِوانہ کو پھر سے تسبیح، صحیح، بیگانہ اور دیوانہ لکھے گئے۔

اسی طرح سے حسب ذیل مثالیں واضح کریں گی کہ اس لسانی تبدیلی نے زبان کو کس طرح متاثر کیا۔

	تحریک سے پہلے	بعد		تحریک سے پہلے	بعد
۱۔	ستی / سیتی	سے	۳۔	اودھر	اُدھر
				کیدھر	کِدھر
۲۔	یہ	یہ	۴۔	یاں	یہاں
	تجہ	تیری		واں	وہاں

دہلی میں ابھی یہ لسانی تبدیلیاں شروع ہوئی تھیں کہ اُس پر تباہی کے بادل اُمڈ اُمڈ کر آنے لگے آخر کار دِلی اُجڑ گئی اور لکھنؤ آباد ہوگیا۔ اگرچہ دِلی کی سجی سجائی محفل

وہاں منتقل ہو جاتی ہے اور عرصہ تک اپنی زبان اور روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن غیر آب و ہوا میں اس کا سرسبز ہونا محال تھا۔ لکھنؤ شرقی ہندی کے علاقہ میں آباد ہے اور وہاں کی اُردو زبان اُردھی سے بہت کچھ متاثر ہوئی ہے۔

لکھنؤ کی خدمات لکھنؤ میں پہلے دہلی ہی کی زبان کی تقلید کی گئی کیونکہ بڑے بڑے شاعر اور اربابِ علم و فضل دہلی ہی سے آئے تھے۔ لیکن عہد آصف الدولہ کے بعد جب خود وہاں بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہونے لگے تو اہل لکھنؤ نے جیسے سیاسی حیثیت سے خود مختاری کا اعلان کیا۔ زبان میں بھی خود کو دہلی کی غلامی سے آزاد کر لیا اور جیسے جیسے لکھنؤ کی تصنیف و تالیف میں اضافہ ہوتا گیا وہ ایک جداگانہ دبستان بنتا گیا۔ وہاں کے الفاظ، محاورے، اور روزمرّہ جو پہلے غلط سمجھے جاتے تھے اب مستند ہو گئے۔ یہ بغاوت اہلِ دہلی کے لئے ناگوار تھی چنانچہ آپس میں چشمک ہونے لگی۔ اُدھر میر امن نے "باغ و بہار" میں اپنی زبان پر فخر کیا۔ اِدھر رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں اسکا جواب دیا:

"اگرچہ اس ہیچمرز کو یہ یارا نہیں کہ دعوئ اردو زبان پر لائے یا اس افسانہ کی نثاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا وہاں چندے بود و باش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصہ میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصہ میں یہ زبان آئی ہے دلی کے روڑے ہیں محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ یہ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ صفت میں ٹھیک

> بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودگی سے
> انکار بلکہ ننگ وعار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

مگر اہل لکھنؤ کی آزاد خیالی اور ایک جداگانہ دبستان کے قیام کے باوجود دہلی والوں کا احساس تفوق نہیں مٹ سکا۔ میر مہدی مجروح جن کی آنکھوں کے سامنے دہلی کی محفلیں تباہ وبرباد ہوگئیں اور سلطنت مغلیہ کا جھلملاتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔ مرتے دم تک دہلی کی لکھنؤ پر فوقیت جتاتے رہے، حالانکہ اُن کے اُستاد غالب ہمیشہ اُنھیں ڈانٹتے رہتے تھے کہ:۔

> "اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ ارے اب اہل دہلی ہندو یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں...
> قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اردو بازار باقی نہ رہا۔ اردو کہاں دلی کہاں ؟ واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔ (اُردوئے معلیٰ)

غرض دہلی والوں کے انکار اور مخالفت کے باوجود لکھنؤ اردو کا مرکز بن ہی گیا اور وہاں کی زبان بھی معیاری قرار پائی۔ لکھنؤ کی اُردو پر عربی اور فارسی کا زیادہ اثر

ہے۔ وہاں ان زبانوں کے اجنبی اور مشکل سے مشکل الفاظ عام طور پر رائج ہو گئے ہیں

دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں میں جمع بنانے کے طریقوں اور ان کی تذکیر و تانیث میں بھی فرق ہے۔ دونوں جگہوں کے مقامی الفاظ، محاورے اور روزمرہ جدا جدا ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر الفاظ کے تلفظ میں بھی فرق ہے۔ یہ موضوع نہایت وسیع ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند اختلافی امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

۱۔ لکھنؤ میں علامت مصدر "نا" کو مونث کی خاطر "نی" نہیں بناتے۔ مثلاً:

لکھنؤ	دہلی
روٹی کھانا پڑے گی	روٹی کھانی پڑے گی
کلیاں بھیجنا ہیں	کلیاں بھیجنی ہیں

۲۔ لکھنؤ میں لفظ "ہی" ضمائر کے بعد "ہیں" کی شکل میں منتقل ہو جاتا ہو مثلاً:۔

لکھنؤ	دہلی
تمھیں	تم ہی
انھیں	ان ہی
ہمیں	ہم ہی

۳۔ دہلی میں حروفِ جر لفظ "ہی" سے پہلے لاتے ہیں اور لکھنؤ میں "ہی" کے بعد مثلاً:۔

لکھنؤ	دہلی	لکھنؤ	دہلی
ہمیں کو	ہم کو ہی	تمھیں سے	تم سے ہی
اُسی نے	اُس نے ہی	اُنہیں کا	اُن کا ہی

۴۔ دہلی میں الفاظ "تم" اور "آپ" کے لئے افعال میں لحاظ نہیں کیا جاتا۔ لکھنؤ والے ہمیشہ فرق کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

لکھنؤ	دہلی	لکھنؤ	دہلی
تم بیٹھو	تم بیٹھے، تم بیٹھو	تم چلو	تم چلیے
آپ بیٹھئے	آپ بیٹھیے، آپ بیٹھو		تم چلو
	تم چلو	آپ فرمائیے	آپ فرماؤ، آپ فرمائیے

۵۔ بعض الفاظ لکھنؤ میں مونث ہیں اور دہلی میں مذکر۔ اسی طرح یہاں بعض مونث ہیں جو وہاں مذکر بولے جاتے ہیں۔

لفظ	لکھنؤ	دہلی	لفظ	لکھنؤ	دہلی
سانس	مونث	مذکر	طرز	مذکر	مونث
فکر	مونث	مذکر	التماس	مذکر	مونث

۶۔ لفظی شکلوں یا تلفظ کے اختلافات کی مثالیں یہ ہیں۔

لکھنؤ	دہلی	لکھنؤ	دہلی	
کراہنا	کرّاہنا	پیاسا	پَیاسا	ان تینوں الفاظ کی درمیانی یی، دہلی میں متحرک ہوتی ہے
اُنتیس	اُنتّیس	پیارا	پَیارا	
اُدھر	اَدھر	پیاس	پَیاس	

یہ چند ہی اختلافات ہیں اگر کوئی شخص دونوں جگہ کے شاعروں کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرے تو اور بھی بہت سی خصوصیتیں ظاہر ہوں گی۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ نے زبان کی اصلاح، تعیین اور صفائی کی بہت

اچھی کوشش کی۔ خود دہلی والے آخر کار لکھنؤ کی تقلید کرنے لگے تھے اور وہاں کی نئی نئی تحریکات اور مفید اصطلاحات معلوم کرنے کے لئے چشم براہ رہتے تھے۔

لکھنؤ ہی کی اس عظیم الشان خدمت کا نتیجہ تھا کہ وسط انیسویں صدی عیسوی میں اردو معراج کمال کو پہنچ گئی۔ اس زمانہ میں وہ تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان بن گئی تھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی علمی وادبی زبان بھی یہی تھی۔ اسی میں وہ کتابیں لکھتے اور شعروشاعری کرتے تھے اور یہی زبان ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے رہنے والوں کے آپس میں ذریعۂ گفتگو تھی۔ اس زمانہ میں کسی کو خواب وخیال بھی نہیں تھا کہ اردو بدیسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس لئے بدیسی ہے۔ سب تسلیم کرتے تھے کہ ہندوستان کی عام مشترک زبان اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ہندوستانی ہی ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے اختلافات کی وجہ سے ایک ایسا نامبارک جھگڑا اردو بولنے والوں میں پیدا ہو گیا جس کے مضر اثرات سے اردو اس وقت تک نجات نہ پاسکی۔ اہل زبان اور غیر اہل زبان یا زبان داں کے مابین فرق وامتیاز کرنا اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا جس شدت عصبیت کے ساتھ اردو دنیا میں پایا جاتا ہے کسی زبان کی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا آئے دن کے ایرانی نو واردوں کی وجہ سے ہوئی جو ہندوستان کے علما وفضلا کو اپنے مقابلہ میں کم رتبہ سمجھتے تھے اور اپنی فوقیت کا زیادہ تر ثبوت اپنے اہل زبان ہونے سے دیتے تھے۔ ہندوستان کا فارسی شاعر یا انشا پرداز خواہ کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو ایک ادنیٰ درجے کے ایرانی شعر کے مقابلہ میں ہار مان جاتا۔ یہ احساس پستی ہندوستانیوں کی رگ وپے میں اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ ہر اہل قلم خود کو کسی نہ کسی طرح ایرانی النسل ثابت کرنا چاہتا۔ قتیلؔ، اور

واقف جو فارسی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے مرزا غالب کی نظر میں اس لئے ذلیل ہیں کہ ہندوستانی الاصل ہیں۔ انھوں نے برہان قاطع کے جواب میں جو قاطع برہان لکھی اور پھر جواب الجواب اور اعتراضات کے سلسلہ میں خطوط یا مضامین لکھے وہ سب اسی اہل زبان اور غیر اہل زبان کے جھگڑوں سے معمور ہیں۔

غرض جب لکھنؤ والوں نے زبان میں اصلاح اور کانٹ چھانٹ شروع کی تو دہلی والوں نے انھیں غیر اہل زبان قرار دے کر اس پر اعتراضات کئے اور انھیں اس کام کا اہل نہیں سمجھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ خاص خاص محلّوں یا گلی کوچوں کے باشندوں تک اہل زبان ہونا محدود تھا۔ پھر زباں دانی کے بھی کئی طبقے تھے۔ خاص خاص شہر والوں کی زبان کو قابل گفت و شنید قرار دیا جاتا اور دوسرے مقامات والے تو زبان کے لحاظ سے قطعاً معذور سمجھے جاتے لیکن جب لکھنؤ نے اپنا لوہا منوالیا تو وہ بھی اہل زبان قرار پائے۔ لیکن بعد کو خود لکھنؤ والے اتنے متعصب ہو گئے کہ اپنے قرب و جوار کے رہنے والوں کو بھی بے زبان قرار دیا۔

یہ مضحکہ خیز تفرقہ آج تک باقی ہے گو اتنا شدید نہیں لیکن یہ خیال اُردو کی ہمہ گیری کے لئے مضر ہے۔ اگر اردو کو صحیح معنوں میں ترقی کرنا ہے تو اس قسم کے تعصبات اور کمزوریاں جلد سے جلد دور ہونی چاہئیں۔ آج سے بہت پہلے اُردو مشہور انشا پرداز اور لسانی پروفیسر سلیم نے لکھا تھا کہ:-

> "یہاں زبان اور قلم کے بہت سے دربان موجود ہیں جو کہتے ہیں جو الفاظ پہلے زبان میں بن چکے وہ سب سماعی ہیں۔ اُن پر قیاس کرکے نئے الفاظ بنانے کی اجازت نہیں ہے مگر یہ مقولہ اُن اشخاص کا ہے جو پُرانی لکیر کے

فقیر ہیں جو اپنی زبان کو وسیع کرنا نہیں چاہتے بلکہ بنے بنائے الفاظ کو گھٹاتے اور ترک کرتے جاتے ہیں۔ ۔۔ ۔۔ اُردو زبان اب دہلی اور لکھنؤ میں محدود نہیں رہی ہے۔ وہ ان حدوں کو توڑ کر باہر نکل چکی ہے اس لئے اب اسی قدر وسعت کی ضرورت ہے جس قدر کہ ہندوستان میں وسعت ہے۔" (افادات سلیم صفحہ ۲۳)

عہدِ حاضر

اُردو ہندی کا جھگڑا، اسباب نتائج، اُردو کی ضرورتیں

انگریز کمپنی نے اٹھارویں صدی کے اختتام پر فورٹ ولیم کلکتہ میں ایک کالج قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز عہدہ داروں کو ہندوستانی زبان سکھائیں اور ساتھ ہی عیسائی مذہب کے متعلق اس زبان میں معلومات فراہم کریں چنانچہ کئی کتابیں لکھوائی گئیں اور ان کی وجہ سے اُردو نثر کے ذخیرہ میں بہت اچھا اضافہ ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی کی ہمہ گیری کے حق میں یہ کالج سم قاتل ثابت ہوا۔

اسی کالج میں وہ خیال ہندوستانیوں کے دماغوں میں بیج کی طرح بویا گیا جو آہستہ آہستہ ایک خوفناک تناور درخت کی شکل حاصل کر کے تمام فضا میں سمی اور مہلک ہوا پھیلانے لگا۔ اس کالج کے قیام سے پہلے اردو زبان کی ناگری رسم الخط میں لکھنے کا شاید ہی کسی کو خیال گذرا ہو۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے اپنے ہندو منشیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس عام مشترکہ زبان کو اپنی قدیم ادبی زبانوں سنسکرت اور برج بھاشا کے رسم الخط میں لکھیں کیونکہ فارسی رسم الخط ہندوؤں اور ہندوستانیوں کے لئے بدیسی ہے جس طرح ہندو اور مسلمان صدیوں کے میل جول اور یکجائی کے بعد بھی جداگانہ طرز معاشرت اور ذہنیت رکھتے ہیں ضروری ہو کہ ان کا رسم الخط بھی اُن کی ضروریات اور رجحانات کے مطابق جدا ہو۔

اس تحریک سے پہلے ہندو اور مسلمان دونوں اگر برج بھاشا میں یا اس کی تقلید میں شاعری کرتے تو وہ ناگری رسم الخط ہی میں لکھی جاتی تھی لیکن نثر اور کاروباری اور سرکاری مراسلت کے لئے ہمیشہ فارسی رسم الخط ہی مستعمل ہوتا تھا۔ یہ تخصیص کہ ناگری ہندوؤں کی ہے اور فارسی مسلمانوں کی قطعاً صحیح نہیں۔ ناگری مخصوص تھی برج بھاشا اور اسی طرز کی شعر و شاعری کے لئے اور فارسی رسم الخط عام تحریر و ل کے لئے رائج تھا۔ مگر جب ذاتی اغراض، قومی پستی اور سیاسی اثرات کام کرنے لگتے ہیں تو حقیقتوں اور تاریخی واقعات سب پر پانی پھر جاتا ہے اور خاص کر ہندوستان میں جہاں ہر چیز مذہبی رنگ حاصل کر لیتی ہے اس قسم کی تحریکوں کا نشو و نما پا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

غرض رفتہ رفتہ یہ تحریک پھیلنے لگی اور جب سرسید احمد خاں کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلمانوں کی انفرادی حیثیت اور قوت کو مستحکم کرنے کے خیال پر عمل پیرا ہوئے تو متعصب قسم کے ہندو بہت چراغ پا ہوئے اور جہاں دوسرے سماجی امور میں مسلمانوں سے جدا مسلک اختیار کئے فورٹ ولیم کالج سے نکلے ہوئے اس خیال کو بھی اپنی تحریک آزادی اور تخیل انفرادیت کے مساوی قرار دے لیا اور لگے مسلمانوں کو مجبور کرنے کہ جب تم ہندی ہو تو اپنی زبان کو بجائے ایک بدیسی یعنی فارسی رسم الخط میں لکھنے کے ہندی یعنی ناگری رسم الخط میں لکھو۔ لیکن خود ہندوؤں کے لاکھوں خاندان اب بھی فارسی رسم الخط ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسے جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے سیاسی اختلافات پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ رسم الخط کا مسئلہ بھی اہم ہوتا جا رہا ہے اور ہندو فارسی چھوڑ چھوڑ کر

ناگری کی طرف بڑھ رہے ہیں ہندوستانی قومی کانگریس نے اس تفرقہ کو بجائے دور کرنے کے اور بڑھا دیا اور مہاتما گاندھی کی تحریک اور اثر نے بھی اس میں تقویت پیدا کی

ناگری رسم الخط کے استعمال نے ہندوستانی کی ہمہ گیری اور ترقی کو بہت دھکا پہنچایا اس تفرقہ کی وجہ سے پہلے وہ تمام ہندوستان کی مشترک علمی وادبی زبان نہ رہی اور پھر اس کا فطری ارتقا محدود ہوگیا۔ ایک ہی زبان ہندوستانی جب ناگری میں لکھی جاتی ہے تو اس کو ہندی کہتے ہیں اور جب فارسی رسم الخط میں قلمبند ہوتی ہے تو اُردو کہلاتی ہے۔ چونکہ ہندوستانی کی اس جدید شاخ ہندی اور برج بھاشا کا رسم الخط کے اشتراک کی وجہ سے ہندی میں برج بھاشا اور سنسکرت کے زیادہ سے زیادہ الفاظ داخل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انہی اجنبی الفاظ کی وجہ سے جب کوئی اُردو داں ہندی سُنتا یا پڑہتا ہے تو وہ اس کو بالکل برج بھاشا معلوم ہوتی ہے۔

ہندی کی یہ برج بھاشا نمائی روز بروز اس لئے ترقی کرتی جارہی ہے کہ ہندی کے علمبردار اس کو خواہی نہ خواہی برج بھاشا ہی کی جدید شکل ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار کرنے کی طرف مائل ہیں کہ اردو ہندی در اصل ایک ہی ہیں اور صرف للو جی لال کے زمانہ سے ان دونوں میں تفرقہ پیدا ہوا ہے چنانچہ ہندی زبان اور ادب سے متعلق شیام سندر داس کی دلچسپ اور مبسوط تاریخ شائع ہوئی ہو اُس میں اُنھوں نے اُس کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب (ہندی بھاشا اور ساہتیہ) اس موضوع پر ہندی کی جدید ترین تصنیف ہے اور لسانی حیثیت سے بھی قابل قدر ہے۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی کوئی کتاب اردو زبان کے متعلق ابتک نہیں لکھی گئی

مگر جہاں دوآبہ اور اس کے اطراف واکناف کی زبانوں کی خصوصیتوں اور اختلافات کے متعلق اس کتاب میں نہایت مفید مواد ملتا ہے۔ یہ معلوم کر کے افسوس ہوتا ہے کہ جدید ترین تحقیقات سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔

اس میں بھی گریرسن کے بیرونی اور اندرونی دائروں کو تسلیم کر کے اسی کے مطابق ہندوستان کی آریائی زبانوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور جملہ غلط فہمیوں کو بطور شواہد کے نقل کیا ہے۔

للو جی لال کی پریم ساگر سے پہلے ہندوستانی کی جن دو کتابوں کا ناگری میں لکھا جانا ثابت کیا گیا ہے۔ وہ یا تو ادبی اہمیت نہیں رکھتیں یا برج بھاشا آمیز زبان میں لکھی گئی ہیں اُردو اور ہندی کو بالکل مختلف زبانیں سمجھنا یا سمجھانا نہ صرف حقیقت کی پردہ پوشی کرنا ہے بلکہ ہندوستانیوں کے آپس کے اختلاف میں تقویت بخشنا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو کی موجودہ افتاد کے متعلق ہندی انشاپردازوں کے جو خیالات یا اعتراضات ہیں وہ ہمارے لئے قابل غور ہیں چنانچہ اس متذکرہ تاریخ زبان وادب ہندی میں عہد حاضر کی اُردو کے متعلق حسب ذیل چار نقاط بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ اُردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ روز بروز داخل ہو رہے ہیں اور وہ بھی اردو بن کر نہیں آرہے ہیں۔ بلکہ بالکل اجنبیوں کی سی شکل میں۔

۲۔ اُردو پر فارسی قواعد کا اثر شدت سے عمل کر رہا ہے۔ اردو لفظوں کی جمع ہندی طرز پر نہ بنا کر فارسی طریقوں پر بنائی جاتی ہے جیسے کاغذ، قصبہ اور امیر کی جمع کاغذوں قصبوں اور امیروں نہ بنا کر کاغذات، قصبات اور اُمرا بناتے ہیں اور اس قسم کی جمع کا رواج روزافزوں ہے۔

۳۔ اکثر فارسی اضافت کے ذریعہ مرکب الفاظ بنائے جاتے ہیں جیسے ستارۂ ہند، دفتر فوجداری، مالک مکان۔ اسی طرح معمولی حروف جر کے، سے وغیرہ کیلئے فارسی لفظ "از" مستعمل ہوتا ہے جیسے از خود، از طرف، اسی طرح "میں" اور "سے" کی جگہ "در" استعمال کیا جارہا ہے جیسے دراصل، درحقیقت، کہیں کہیں "در" کی جگہ عربی "فی" بھی لکھا جاتا ہے جیسے فی الحال، فی الحقیقت۔

۴۔ ہندی اور اُردو کا سب سے بڑا فرق صرفی ترکیب میں نظر آتا ہے۔ ہندی میں پہلے فاعل پھر مفعول اور پھر فعل لاتے ہیں مگر اُردو کے جملوں میں معلوم ہوتا ہے کہ اُلٹ پھیر ہے اس میں فعل کو فاعل سے پہلے بھی لاتے ہیں مثلاً۔ "راجہ اندر کا آنا" نہ کہ "آنا راجہ اندر کا" کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ نہ کہہ کر کہ: "اس نے ایک نوکر سے پوچھا" یہ کہیں گے "ایک نوکر سے اس نے پوچھا"۔

ارباب ہندی کا سب سے بڑا اعتراض فارسی اور عربی لفظوں کی درآمد کے متعلق ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ خود ہندی میں سنسکرت اور برج بھاشا کے کیسے کیسے غریب اور نامانوس الفاظ روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش تو اُردو یا ہندوستانی کی سرشت میں داخل ہے ان میں سے اکثر لفظ خود اردو ہو گئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نئے نئے الفاظ کا داخلہ جہاں تک ہوسکے روکنا چاہیئے اور یہ خیال اس وقت اردو کے تمام اہل ذوق انشاپردازوں میں مقبول ہو گیا ہے، لیکن ہندی کے ایسے کتنے اہل قلم ہیں جو سنسکرت اور برج بھاشا کو چھوڑ کر قدیم لفظی خزانہ پر قانع رہنا چاہتے ہیں۔ للو لال جی کی پریم ساگر سے اس متذکرہ تاریخ زبان وادب ہندی کا درمیانی زمانہ کوئی طویل نہیں ہے لیکن اس عرصہ میں ہندوستانی کی اس شاخ

(یعنی ہندی) نے اپنے لفظی خزانہ کو طوفانی رفتار کے ساتھ بدل دیا۔ تمام فارسی الفاظ اور ترکیبیں نکال پھینکیں۔ یہاں تک کہ ان چھوٹے چھوٹے اور معمولی فارسی لفظوں کو بھی ترک کر دیا جو آجتک اُن کی بول چال کی زبان میں موجود ہیں اور ہندوستانی کا جزو بن گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ امر قابل غور ہے کہ ان معمولی سے معمولی اور مستعملہ فارسی لفظوں کو خارج کر کے ان کی جگہ انھوں نے ایسے ایسے سنسکرت اور برج بھاشا الفاظ اختیار کر لیے کہ اُن کا سمجھنا اہل اُردو تو کجا خود اہلِ ہندی کے لئے اس وقت تک دُشوار ہے

اردو اور ہندی کے اس روز افزوں اختلاف کو دور یا کم کرنے کی خاطر صوبہ متحدہ کی سرکار نے ایک اکیڈمی قائم کی ہے جس میں دونوں زبانوں کے عالم و فاضل مفکر اور اہلِ قلم کام کر رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ آجتک کوئی تدبیر ایسی نہیں بن پڑی کہ یہ اختلاف دور ہو سکے۔ اس اکیڈمی کی گذشتہ کانفرنس صرف یہ تصفیہ کر سکی کہ دونوں زبانوں کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانا چاہیئے اور بس۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس اختلاف کو دور کرنے والی اکیڈمی کے خود اجلاس ہی اس اختلاف کو بڑھا رہے ہیں اندیشہ ہے کہ ہندی اور اُردو شعبوں کے جلسوں کا جدا جدا ہونا آپس کے اختلافی خلیج کو پاٹنے کی جگہ اور وسیع کر دے گا۔

اس وقت تک رسم الخط کے علاوہ اُردو اور ہندی کے آپس میں جو اختلاف ہیں وہ ایسے پختہ ہوتے جا رہے ہیں کہ اگر اب بھی کوئی مجتمعہ کوشش نہ کی جائے تو یہ دونوں زبانیں شاید مستقبل قریب ہی میں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گی۔ ان اختلافات پر تحقیقی بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں ان میں سے

چند کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ دونوں زبانوں کے حروفِ عطف میں کافی فرق ہو گیا ہے۔ ذیل کی مثالیں ظاہر کریں گی کہ ہندوستانی کے چھوٹے چھوٹے اور عام مستعملہ لفظوں کی جگہ کیسے کیسے لفظ ہندی میں رائج کئے جا رہے ہیں۔

اُردو	ہندی	اُردو	ہندی	اُردو	ہندی
اور	تتھا، ایوم	یا	اتھوا، وا	مگر	پرنتو، کنتو
یعنی	ارتھات	جیسے، گویا	مانو	اگر	یدی

۲۔ بہت سے فارسی اور عربی اسماء و صفات ہندوستانی میں آکر بالکل ہندوستانی بن گئے تھے۔ ان میں اکثر کے مفہوموں میں بھی تغیر و تبدل ہو گیا تھا مگر اربابِ ہندی نے ان کو بھی بدیسی سمجھا۔ اور ان کے لئے ٹھیٹ سنسکرت اور پراکرت سے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے۔ جیسے:۔

اُردو	ہندی	اُردو	ہندی	اُردو	ہندی
زندگی	جیون	خواہش	اچھا	خیال	وچار
خبر	سماچار	حکم	آدیش	کوشش	ادیوگ
سہولت	سویدھا	ناکامیاب	اسمرتھ	موافق	انوسار
نہایت	اتینت	موجودہ	ورتمان	مختصر	سمکیشپ

۳۔ ہندی اور اُردو افعال اور محاوروں کے اختلاف کی مثالیں یہ ہیں:۔

اُردو	ہندی	اُردو	ہندی	اُردو	ہندی
شریک ہونا	سمیلت ہونا	تبدیل کرنا	پری ورتن کرنا	مشق کرنا	ابھیاس کرنا

ٹھان لینا نشچے کرنا ظاہر ہونا پرتیت ہونا یقین کرنا وشواس رکھنا

۴۔ دونوں بولیوں میں اصطلاحوں کا بھی بڑا فرق ہے اور جیسے جیسے جدید علوم و فنون ان زبانوں میں منتقل ہو رہے ہیں یہ اختلاف بڑھتا جا رہا ہے اُردو والے عربی اور فارسی سے مشتق کر رہے ہیں اور ہندی والے سنسکرت اور برج بھاشا سے۔ ہم یہاں صرف شاعری کی اصطلاحات کی مثالیں لکھتے ہیں جو ان دونوں زبانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

اُردو	ہندی	اُردو	ہندی	اُردو	ہندی
تغزل	شُنگارس	مرثیہ	کرونڑارس	ہجو	دی بھتبس
لطیفہ	ادبھوت	طنزیہ	سیہ رس	رجز	رودر

ان چند معمولی اختلافات کے اظہار کے بعد ہم ہندی کی بول چال کی اور تحریری زبانوں کے نمونے یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ایک تو ان کے آپس کا فرق معلوم ہوگا اور دوسرے اگر اردو کی تقریری یا تحریری زبان سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ کس طرح ایک ہی زبان کی دو شاخیں ایک صدی کے اندر ہی اندر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔

۱۔ ہندی بول چال کی زبان کا نمونہ:۔

"میں بڑے سنکٹ میں تھا۔ اگر ماں کی طرف سے کچھ کہتا ہوں تو تینی جی رونا دھونا شروع کرتی ہیں۔ اپنے نصیبوں کو کوسنا شروع کرتی ہیں۔ تینی کی کہتا ہوں تو زن مرید کی اپادھی ملتی ہے اس لئے باری باری سے دونوں پکشوں کا سمرتھن کرتا جاتا تھا۔ میرے

سینما کا بجٹ ادہر سال بھر سے بالکل غائب ہو گیا تھا۔ پان پتہ کے خرچہ میں بھی کمی کرنی پڑی تھی۔ بازار کی سیر بند ہو گئی تھی۔ کس کر تو اماں سے کہہ نہ سکتا تھا پر دل میں سمجھ رہا تھا کہ زیادتی انھیں کی ہے۔ دکان کا یہ حال ہے کہ کبھی کبھی بھونی نہیں ہوتی۔ اسامیوں سے ٹکہ وصول نہیں ہوتا۔"

(جاگرن بنارس)

ب۔ ہندی علمی یا رسائل کی زبان کا نمونہ:۔

"ویدے پی ڈاکٹر رادھا کمار مکرجی نے اپنی پرسدہ پستک میں یہ سدھ کر دیا ہے۔ پراچین بھارت ورش میں بھی لوگ چاروں دوار اسور دیشوں کی یاترا کیا کرتے تھے آدھونک سمئے میں ہمارا دیش نادک شکشن میں کتنا پچھڑا ہوا ہے۔ اس کے کہنے کی آوشیکتا نہیں۔ بہت دنوں سے بھارت سرکار سے سینک تتھا نادک شکشا دے کر بھارتی یووکوں کو اتساہت کرنے کے لئے انورودھ کیا جا رہا تھا۔ انت میں دونوں دی بھاگوں میں کچھ پرار بھک کارے کاری گنیش کیا گیا

(مادھری۔ لکھنؤ)

بول چال کی زبان کا نمونہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندی ابھی اُردو سے زیادہ دور نہیں ہوئی ہے مگر رسائل کی علمی زبان کا نمونہ ثابت کرتا ہے کہ کس طرح ہندی کے اہل علم وفضل اپنی تحریری زبان کو اپنی بول چال کی زبان سے اور اس طرح ہندوستانی یا اردو سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی جدائی یا انفرادیت ممکن ہے کہ خاص عقائد کے ماننے والوں کی نظر میں مفید ہو۔ لیکن ہندوستان کی متحدہ قومیت اور خاصکر ہندوستانی

کی ہمہ گیری اور یکسانیت کے حق میں نہایت مضر ہے۔ روشن خیال انشا پردازوں اور اہلِ علم پر فرض ہے کہ اس کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہوں۔

ہندی کے علمبردار ہندی کی ترقی اور اصلاح کے لئے جتنے ہی تلے ہوئے ہیں اتنا ہی اربابِ اُردو اپنی زبان کی اصلاح اور اس پر غور و خوض کرنے سے غافل ہیں۔ ہمارے یہاں پہلے تو اہلِ زبان اور زبان داں کے اختلافات اور امتیازات ہیں اور پھر جو اہلِ زبان ہیں وہ اس کی طرف متوجہ ہونا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ حالانکہ جیسے جیسے جدید علوم و فنون اردو زبان میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ اُردو کی ضرورتوں پر غور و خوض کرنا اس زبان کے ہر ایک ہمدرد اور دلچسپی رکھنے والے کے لئے لازمی ہو گیا ہے۔

۱۔ اُردو کی جدید ضرورتیں متعدد ہیں۔ لیکن سب سے پہلے اس کی طباعت و اشاعت کی دِقتوں کو دور کرنا چاہیئے اور یہ کم نہیں ہو سکتیں جب تک پتھر کا چھاپہ چھوڑ کر ٹائپ کے حروف اختیار نہ کر لئے جائیں۔

۲۔ ا۔ اردو کا رسم الخط اور املا بھی قابلِ توجہ ہے۔ جب تک ہمارے حروف اور آوازوں میں ہم آہنگی نہ ہو، ہمارے لفظوں کی شکلیں متعین نہ ہوں، اور اجنبی لفظوں کے لکھنے کے لئے مقررہ طریقے نہ بنیں، ناممکن ہے کہ ہماری زبان میں وہ یکسانیت یا انفرادیت پیدا ہو سکے جس کی ہماری اُردو کو ضرورت ہے۔ اس قسم کی اصلاحوں کے بعد ہماری زبان اس قابل ہو جائے گی کہ ہماری آنے والی نسلیں جلد سے جلد اس کو سیکھ سکیں گی اور تحصیل زبان کی دقتوں میں کمی ہونے کی وجہ سے خیالات اور معلومات میں جلد سے جلد اضافہ اور فراوانی ہو سکے گی۔

اس وقت ہماری تحریروں میں نفسی حروف صحیح (جیسے بھ پھ تھ ٹھ وغیرہ) اور مرکب حروف جیسے ب، ہ یات، ہ) کے لکھنے کے طریقوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہائے متحرک اور ہائے ساکن ایک ہی طرح لکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے زبان میں حکمیاتی رو سے خامی رہتی ہے اور پھر پڑھتے وقت مغالطوں کا اندیشہ ہے۔ دو جدا جدا لفظ ہیں جن کے معنی اور آوازیں بھی جدا ہیں مگر دونوں کی شکل یا لکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ اُردو میں ایسے متعدد لفظ ملتے ہیں جن میں سے صرف دو لفظ یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

لفظ	مطلب
کِھلانا	۱۔ غذا دینا۔ ۲۔ کِنے کی فرمائش کرنا
بھرا	۱۔ جس کو سنائی نہ دے۔ ۲۔ جو خالی نہ ہو

انھیں دو لفظوں کو کھلانا اور بہرا بھی لکھتے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ دو چشمی اور سادہ ہائے ہوز کا استعمال مقرر کر دیا جائے۔

۲۔ ہماری زبان میں آئے دن انگریزی لفظ داخل ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان کے لکھنے کا طریقہ معیّن نہیں ہے۔ ایک لفظ کئی شکلوں میں لکھا ہوا نظر آتا ہے جس کی وجہ سے زبان اور اہل زبان دونوں کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً حسب ذیل معمولی انگریزی الفاظ کی اُردو شکلیں قابل غور ہیں:-

۱۔ Bicycle	بائیسکل	بائسکل	بیسکل
۲۔ Light	لائیٹ	لائٹ	لیٹ
۳۔ Hat	ہیاٹ	ہَیٹ	

۳۔ انگریزی کے علاوہ دوسری یورپی زبانوں کے الفاظ کی اُردو شکلیں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی فرانسیسی یا جرمن لفظ کا تلفظ ان زبانوں میں ایک ہوگا اور انگریزی میں دوسرا۔ لیکن اُردو میں وہی لفظ کبھی فرانسیسی تلفظ کے مطابق لکھا جاتا ہے اور کبھی انگریزی جس کی وجہ سے اکثر غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور دو جدا جدا لفظ معلوم ہونے لگتے ہیں شلاً ذیل کے فرانسیسی ناموں کی اُردو شکلیں غور طلب ہیں:۔

۱۔ Jules Block	ژولس بلوک	جیولس بلاک
۲۔ Durand	دیران	ڈیورنڈ

۴۔ یورپی زبانوں کے بعض الفاظ اردو میں معرب و مفرس شکل میں رائج ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہی الفاظ اصلی یورپی تلفظ کے مطابق بھی اردو میں رائج ہیں اور اگر نہیں ہیں تو اُردو حروفِ تہجی میں اتنی گنجایش ہے کہ اصلی تلفظ کے مطابق بھی لکھے جا سکتے ہیں شلاً حسبِ ذیل مثالیں قابلِ توجہ ہیں:۔

	عربی شکل	اُردو شکل
۱۔ PROPAGANDA	بروبغندا	پروپگنڈا
۲۔ TELEGRAPH	تلغراف	ٹیلیگراف
۳۔ PARLIAMENT	بارلمان	پارلیمنٹ

ضرورت ہے کہ اربابِ اُردو ان تمام متذکرہ قسموں کے اجنبی الفاظ کے لکھنے کا طریقہ معین کرلیں۔

ب۔ رسم الخط اور تلفظ کے بعد دوسرا قابلِ توجہ امر بیرونی عناصر کی مدافعت اور اُردو کی فطرت کی حفاظت ہے۔ آج کل اردو زبان میں انگریزی الفاظ کا سیلاب

طوفانی رفتار کے ساتھ گھستا چلا آ رہا ہے۔ نہ صرف گفتگو یا بول چال کی زبانوں میں بلکہ علمی و ادبی تقریروں اور تحریروں میں بھی انگریزی الفاظ بے دھڑک استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ رجحان اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو ان انگریزی الفاظ استعمال کرنے والوں کو خود اپنی زبان پر عبور نہیں ہے یا وہ احساس پستی میں مبتلا ہیں اور چاہتے ہیں کہ انگریزی لفظوں کے ذریعہ سے اپنی لیاقت اور علمیت کا اظہار کریں۔ مثلاً یہ کہیں گے:-

"ان کے لیکچر میں یہ پائنٹ اچھا نہیں تھا" یا "میں اس کو لائک نہیں کرتا" حالانکہ ان لفظوں کا مطلب اُردو میں اچھی طرح ظاہر ہو سکتا تھا

یہاں یہ امر واضح ہو جانا چاہیئے کہ اس وقت تک جو انگریزی الفاظ داخل ہو چکے ہیں اور ان میں سے اکثر اُردو بن گئے ہیں ان سے ہمیں بحث نہیں، یہاں ہماری مراد صرف نئی لفظی درآمد سے ہے جو روز بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ ممکن ہے کہ بعض انگریزی لفظوں کا واضح ترجمہ معیاری اُردو میں نہ مل سکے۔ لیکن انگریزی لفظ استعمال کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہندوستانی کی کسی صوبجاتی شاخ کا کوئی لفظ اختیار کر لیا جائے کچھ دنوں تک وہ غیر مانوس رہے گا اور اگر اس میں زندہ رہنے کی طاقت ہے تو بہت جلد عام ہو جائے گا۔

انگریزی لفظوں کی طرح عجیب و غریب اور اجنبی عربی اور فارسی لفظوں کی درآمد بھی روک دینی چاہیئے اور اسی کے ساتھ عربی جمع کا استعمال بھی کم ہو سکتا ہے۔ یہ وہ امر ہے جس کی طرف شیام سندر داس صاحب کی تاریخ ہندی زبان کا اقتباس ہم ابھی دے آئے ہیں۔

ج۔ اُردو کی فطرت کی حفاظت کے ساتھ اس میں قطعیت اور یکسانیت پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے جو ہر اعلیٰ علمی زبان کی ممتاز خصوصیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں چند کے کئی مسائل زیرِ غور آجاتے ہیں جن میں سے ہر ایک ارباب علم و فضل کی توجہ کا محتاج ہے۔

آخر میں اس امر کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ ہر زبان کے انشاپردازوں اور عالموں کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی تنقیح کرتے رہیں۔ اس کے متعلق اسی کتاب میں عنوان "ادادی تشکیل کے سلسلہ میں وضاحت اور تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ہمارے اہل علم و فضل کا سب سے اہم فریضہ یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کی حفاظت کریں۔ اگر زبان کی اصلاح و ترقی نہ ہوگی تو ادبی قابلیتیں بھی ترقی نہ پاسکیں گی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ادب ہی کی ترقی پر ملک و قوم کی ترقی کا انحصار ہے۔

کتابیات

اس کتاب کی تیاری کے وقت جن کتابوں کا مطالعہ کیا گیا وہ یہ ہیں:-

۱۔ سینتی کمار چیٹرجی	آغاز وارتقائے زبان بنگالی	(انگریزی)
۲۔ "	کلکتہ کی ہندوستانی	(انگریزی)
۳۔ جولس بلاک	مرہٹی زبان	(فرانسیسی)
۴۔ رام بابو سکسینہ	لکھمپوری (جدید اودھی کی ایک شاخ)	انگریزی
۵۔ حافظ محمود شیرانی	پنجاب میں اردو	(اردو)
۶۔ انشاء اللہ خاں	دریائے لطافت	(فارسی)
۷۔ شیام سندر داس	برج بھاشا اور اس کی تاریخ	(ہندی)
۸۔ جارج ابراہم گریرسن	لسانیاتی تبصرۂ ہند	(انگریزی)
۹۔ جان بیمس	خاکۂ لسانیات ہند	(انگریزی)
۱۰۔ پی، ڈی گونے	مقدمۂ تقابلی لسانیات	(")
۱۱۔ البرٹ ڈوزا	فلسفۂ لسانی	(فرانسیسی)
۱۲۔ البرٹ دوزا	زندگیٔ زبان	(")
۱۳۔ "	جغرافیہ لسانی	(")
۱۴۔ ڈبلیو ڈی ڈھٹنی	لسان ومطالعۂ لسان	(انگریزی)
۱۵۔ جان بیل	لسانیات	(")
۱۶۔ جے واندریئس	زبان۔ لسانیاتی مقدمۂ تاریخ	(فرانسیسی)
۱۷۔ گس مولر	تین لکچر علم السنہ پر	(انگریزی)
۱۸۔ محمد حسین آزاد	مقدمہ آب حیات	(اردو)

اشاریہ



دلی کے یادگار مشاعرے داستانِ پارینہ بن چکے ہیں
لکھنؤ کے تاریخی مشاعرے ماضی کی بھولی ہوئی یاد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے
حیدر آباد کے امتیازی مشاعرے انقلاباتِ زمانہ کے شکار ہو گئے — اور —
رامپور کے شاہی مشاعرے تاریخ کی ایک رنگین کہانی بن کے رہ گئے ہیں
لیکن اگر آپ —
ان تمام مشاعروں کا ایک ہی نشست میں حظ اٹھانا چاہتے ہیں
۱۹۵۱ء تک کے تمام شاعروں کو ایک محفل میں سننا چاہتے ہیں —— اور
ولی دکنی سے آرزو لکھنوی تک ہر مشہور شاعر کا کلام خود اسکی زبان سے سننا چاہتے ہیں —— تو
نسیم بک ڈپو کی پہلی لاثانی ادبی پیش کش
مشاعرہ عالمِ ارواح
ولی دکنی کی زیر صدارت —— ۱۶۶۸ء سے ۱۹۵۱ء تک کا ہر بڑا شاعر
کا مطالعہ کیجیے
منعقد ہونے والے اس مشاعرے میں موجود ہے —— اور اس کے علاوہ
ایک ایسا چارٹ بھی جو ایک ہی نظر میں آپ کو بتا دے گا کہ شاعر کی ولادت و وفات
کا سنہ کیا تھا اور اس کے ہم عصر کون کون تھے —— اور جسکی موجودگی طلبا کو
ضخیم کتابوں کی چھان بین سے مستغنی کر دے گی ——
نسیم بک ڈپو کا چیلنج ہے کہ ایسی ادبی کتاب آج تک نہیں چھپی اور ظاہر ہے کہ
نسیم بکڈپو کا چیلنج کھوکھلا نہیں ہوتا ——
سید مرتضیٰ حسین موسوی کی یہ ادبی تخلیق ادبی دنیا کا سنگ میل ثابت ہوگی ——
قیمت —— چار روپئے
IMTIAZ